بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۱۷-۱۱۸ / ۱۷-۱۸	جولائی — دسمبر ۲۰۱۹ء	ذوالقعدہ ۱۴۴۰ھ — ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ

مدیر

خالدسیف اللہ رحمانی

زرِ تعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ:40روپے

سالانہ:150،بذریعہ رجسٹری:200

سہ سالہ:450،بذریعہ رجسٹری:550

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر

یورپ،امریکہ،افریقہ کے لئے :

سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی "العالم" اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:+91 9959897621

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
● افتتاحیہ	: مدیر	۳
● تصویر کشی میں بڑھتی ہوئی بے احتیاطی	: خالد سیف اللہ رحمانی	۵
● طلاق اور اس سے پیدا ہونے والے بعض سماجی مسائل	: مولانا محمد مصطفیٰ عبد القدوس ندوی	۱۰
● حرمت مصاہرت	: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	۴۰
● بیع وفا اور اس سے متعلق مسائل	: خالد سیف اللہ رحمانی	۶۶
● مطالعہ کے اُصول وآداب	: مولانا عبید اختر رحمانی	۸۹
● حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی فقہی خدمات	: مولانا محمد خالد حسین نیموی قاسمی	۱۱۴
● سفر نامہ: ایشیاء کے دل میں چند دن!	: خالد سیف اللہ رحمانی	۱۳۵

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

۲۷/ مارچ کو ہندوستان میں لاک ڈاؤن کا اعلان ہوا اور اسی کے ساتھ پورا ملک ایک بڑے اور کھلے قید خانہ میں تبدیل ہوگیا، مزدوروں اور غریبوں کے لئے لاک ڈاؤن قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا، لاکھوں افراد جو روزگار کی خاطر دیس کو چھوڑ کر پردیس میں دن گزار رہے تھے، اس ایک اعلان سے لمحوں میں بے آسرا ہو گئے۔

لاک ڈاؤن کے جو اثرات معاشی طور پر پورے ملک پر پڑے، اس سے ہر ایک واقف ہے، یہ لاک ڈاؤن پورے رمضان جاری رہا، جس سے مدارس کی بھی آمدنی شدید متاثر ہوئی، بہت سارے چھوٹے مدارس بند ہو گئے، مدرسین اور ائمہ حضرات پر بھی اس کا غیر معمولی اثر پڑا اور طلبہ کی تعلیم تو اب تک معطل ہے، کہیں کہیں آن لائن تعلیم ہو رہی ہے؛ لیکن یہ براہ راست تعلیم کا مکمل بدل نہیں؛ بلکہ مجبوری کا سودا ہے۔

لاک ڈاؤن کے اعلان سے متاثر ہونے والوں میں دینی مدارس کے جرائد اور مجلّات بھی ہیں، جن میں المعہد العالی الاسلامی سے شائع ہونے والا ہندوستان کا مؤقر علمی سہ ماہی مجلہ ''بحث ونظر'' بھی ہے، شروع میں ارادہ تھا کہ جلد لاک ڈاؤن ختم ہو تو اسے شائع کرایا جائے، مضامین تیار تھے؛ لیکن جب لاک ڈاؤن طویل سے طویل تر ہوتا گیا تو خیال ہوا کہ بہتر ہے کہ جولائی ۲۰۱۹ سے دسمبر ۲۰۲۰ تک کے چھ شماروں کی برقی اشاعت ہو، جس میں دو شماروں کو ایک کر لیا جائے، جیسے جولائی ۲۰۱۹ سے دسمبر ۲۰۱۹ تک کے دو شماروں کو ایک ساتھ شائع کر دیا جائے، اس طرح تین شماروں کی برقی اشاعت ہوگی اور جنوری ۲۰۲۱ء تا مارچ ۲۰۲۱ء کا شمارہ انشاء اللہ حسب معمول پریس میں چھپ کر شائع ہوگا اور قارئین تک پہنچے گا۔

بحث ونظر جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ کے شمارے میں کئی اہم مضامین ہیں، جن سے فکر ونظر کے نئے گوشے وا ہوتے ہیں، اس حقیر کے دو مضمون اور ایک سفر نامہ اس شمارے میں شامل ہیں، پہلا مضمون ''تصویر کشی میں بڑھتی ہوئی بے احتیاطی'' پر ہے، جس میں بطور خاص دینی خدمت سے وابستہ افراد کو اس بے احتیاطی پر متنبہ کیا گیا ہے،

دوسرا مضمون بیع وفا کے متعلق ہے، بیع وفا کی آج کل کے کاروبار پر تطبیق یہ تحریر فقہ اکیڈمی افغانستان کی دعوت پر لکھی گئی تھی، اسی طرح افغانستان کا سفر نامہ بھی شریک اشاعت ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ افغانستان کے چپے چپے پر اسلام کے نقوش ثبت ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس کا تعارف ہوجائے اور وہاں کی مشہور اسلامی شخصیات کا بھی ذکر آجائے اور ماضی وحال کے مشاہدات بھی قارئین کے سامنے آجائیں۔

مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی صاحب کا طلاق سے پیدا ہونے والے بعض سماجی مسائل پر اور مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کا حرمت مصاہرت جیسے اہم موضوع پر مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہیں، ایک مضمون مطالعہ کے اُصول وآداب پر ہے، جس میں مطالعہ کی ترتیب، طریقۂ کار اور اُصول وآداب پر بحث کی گئی ہے، یہ معہد کے شعبۂ تحقیق کے نگراں مولانا عبید اختر رحمانی کے قلم سے ہے۔

اس شمارہ کی عدم طباعت کا ہمیں بھی افسوس ہے؛ لیکن یقین بھی ہے کہ بحث ونظر کے قارئین ہماری مجبوریوں سے واقف ہوں گے، جو لوگ بحث ونظر کے شماروں کی فائل اپنے یہاں محفوظ رکھتے ہیں، وہ اس شمارے کی پی ڈی ایف کا پرنٹ نکال کر اپنے پاس بحث ونظر کی فائلوں کا تسلسل قائم رکھ سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ حالات کو بہتر فرمائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۱۶؍ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ

۲؍دسمبر ۲۰۲۰ء

• • •

تصویر کشی میں بڑھتی ہوئی بے احتیاطی

خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک اہم صفت ''مصوّر'' یعنی صورت گر ہونا ہے ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کو صرف جسم ہی نہیں دیتے ، اس کے مناسب حال صورت بھی عطا فرماتے ہیں ، جس سے چیزیں اور شخصیتیں پہچانی جاتی ہیں ، یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ہے کہ اگر انسان ٹھنڈے دل سے غور کرے تو یہی ایک بات اس کے ایمان لانے کے لئے کافی ہے ، پھر ایسا نہیں ہوا کہ تمام چیزوں کو ایک ہی شکل دے دی گئی ؛ بلکہ ہر قسم کی الگ الگ شکل ہے ، اور اس کے تحت آنے والے ہر فرد کی بھی الگ شکل ہے ، صورت گری کا یہ کمال انسان کے اندر تو بالکل ظاہر ہے کہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہونے والے ہر بچہ کی شکل الگ ہوتی ہے ، رنگ میں بھی فرق ہوتا ہے ، ناک نقشہ میں بھی اور قد وقامت میں بھی ؛ لیکن یہ صرف انسان ہی پر موقوف نہیں ، ہاتھی ، شیر ، چیتا ، بیل اور بکری وغیرہ ، ہر جاندار کو الگ الگ صورتوں سے نوازا گیا ہے ، پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ تمام بکریاں ایک ہی صورت کی ہوں کہ پہنچانی نہ جاسکیں ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان میں بھی ایسا فرق رکھا گیا ہے کہ ہزاروں کی بھیڑ میں جانور کا مالک اپنے جانور کو پہچان لیتا ہے ، قدرت کا یہی اعجاز درختوں ، پھولوں اور پھلوں میں بھی موجود ہے اور اسی تنوع کی وجہ سے انھیں بآسانی پہچان لیا جاتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت اس کی قدرت کے ساتھ ساتھ اس کی وحدانیت کی بھی روشن اور واضح دلیل ہے ؛ مگر انسان نے اپنی احسان ناشناسی اور ناشکری کی وجہ سے اسی کو شرک جیسے گناہ کا ذریعہ بنالیا اور انسانوں و جانداروں کی مورتیاں بناکر ان کی پرستش شروع کردی ، شریعتِ محمدی چوں کہ اللہ کی طرف سے اُتاری جانے والی آخری شریعت ہے ، آپ کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا ، نہ کوئی کتاب نازل ہوگی ، اور نہ کوئی اور شریعت انسانیت کے لئے بھیجی جائے گی ؛ اس لئے اس بات کا خصوصی اہتمام فرمایا گیا کہ جو چیزیں دوسری قوموں میں مشرکانہ افکار کے پھیلنے کا سبب بن گئی تھیں ، اس دین متین میں ان کو منع کردیا جائے ، اور وہ دروازے بند کردیئے جائیں ، جو انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتے رہے ہیں ، جیسے پچھلی شریعتوں میں بطور تعظیم کے اپنے بڑوں کو سجدہ کرنے کی اجازت تھی ، جیسا کہ حضرت

یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے(۱)؛لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمادیا(۲)، رب کے معنی پروردگار کے ساتھ ساتھ مالک کے اور عبد کے معنی بندہ کے ساتھ ساتھ غلام کے بھی ہیں، اس دوسرے معنی کے لحاظ سے غلام اپنے آقا کو رب اور آقا اپنے غلام کو عبد کہا کرتے تھے، آپ ﷺ نے اس تعبیر سے منع فرمادیا اور تلقین فرمائی کہ مالک کو سید اور غلام کو مولیٰ کہا جائے۔(۳)

اسی طرح کے احکام میں تصویر کا مسئلہ بھی آتا ہے، قرآن مجید سے اشارہ ملتا ہے کہ گزشتہ اقوام میں مجسمہ سازی اور تصویر کشی کی اجازت تھی، جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات مجسمے بنایا کرتے تھے(سبا:۱۳)؛لیکن شریعتِ محمدی میں تصویر کشی کو شدت کے ساتھ منع فرمادیا گیا؛ کیوں کہ یہ صورت گری اور تصویر سازی آہستہ آہستہ شرک کا سبب بن جاتی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جو تصویر بنائے؛ کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فعل تخلیق کی نقل کرتا ہے: ’’أشد الناس عذابا عند الله يوم القيامة الذين يضاهون بخلق الله‘‘(۴) آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس گھر میں تصویر ہوتی ہے، اس گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے: ’’إن البيت الذي فيه الصور لا تدخله الملائكة‘‘۔(۵)

اس لئے اُصولی طور پر یہ بات متفق علیہ ہے کہ تصویر کشی حرام ہے؛البتہ احادیث، صحابہ کے آثار اور احکام شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے بعض تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے، امام مالکؒ کے نزدیک سایہ دار تصویر یعنی اسٹیچو بنانا حرام ہے، اور بے سایہ تصویریں جو کاغذ یا کپڑے پر بنائی جائیں، مکروہ ہیں؛ پس سایہ دار تصویر کے حرام ہونے پر مذاہب اربعہ کا اتفاق ہے، اور بڑی حد تک یہ اجماعی مسئلہ ہے، افسوس کہ بعض مسلم ملکوں میں ڈکٹیٹر حکمرانوں نے اپنی مجسمے نصب کرائے، اور گزشتہ دنوں سننے میں آیا کہ وطن عزیز میں بھی کسی جگہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کا مجسمہ نصب کیا گیا، یقیناً اس سے مولانا مرحوم کی روح کو تکلیف ہی پہنچے گی۔

جو تصویریں سایہ دار نہ ہوں، کاغذ پر، کپڑے پر، دیوار وغیرہ پر بنائی گئی ہوں، ان کے سلسلہ میں اختلاف ہے، بعض فقہاء اس کو بالکل حرام قرار دیتے ہیں، یہی زیادہ تر اہل علم کی رائے ہے، امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے، اور فقہاء احناف میں متأخرین نے اسے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، اور مکروہ تحریمی بھی قریب بہ حرام ہوتا ہے؛ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں :

(۱) جامع البیان ۱۳/۳۵۶۔
(۲) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:۱۸۵۳۔
(۳) مسلم، حدیث نمبر:۲۲۴۹۔
(۴) مسلم، حدیث نمبر:۲۱۱۷۔
(۵) بخاری، حدیث نمبر:۲۱۰۵۔

> شوافع اور دوسرے فقہاء نے کہا ہے کہ جاندار کی تصویر سخت حرام ہے، یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور یہ ان شدید وعیدوں کے مصداق میں سے ہے، جن کا حدیث میں ذکر آیا ہے، چاہے یہ ایسی چیز پر بنائی جائے جس کا احترام نہیں کیا جاتا ہے، یا قابل احترام چیز پر بنائی جائے، ہر حال میں حرام ہے؛ چاہے وہ کپڑے پر ہو، یا بستر پر، یا درہم و دینار پر یا برتن اور دیوار وغیرہ پر؛ اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت اختیار کرنا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جب تصویر کسی بھی چیز پر نقش ہوجائے تو پھر وہ حرام کے دائرہ میں آجاتی ہے۔

پہلے زمانہ میں تصویر ہاتھوں سے بنائی جاتی تھی اور اس کے لئے اعلیٰ درجہ کے ماہرین ہوتے تھے، پھر تصویر کی ایک نئی صورت کا آغاز ۱۸۱۶ء میں ہوا، اور اس نے ترقی کرتے کرتے بیسویں صدی کے شروع میں اس وقت بہت عموم حاصل کرلیا، جب ۱۹۱۳ء میں تصویر کھینچنے والا کیمرہ وجود میں آیا، کیمرہ کی تصویر آنے کے بعد اہل علم کے درمیان اختلاف پیدا ہوا کہ یہ ہاتھوں سے بنائی جانے والی تصویر ہی کے حکم میں ہے اور حرام ہے یا اس تصویر کے حکم میں نہیں ہے؟ جمہور علماء نے اسے حرام قرار دیا، سعودی عرب کے مفتیان میں شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخؒ، شیخ عبدالعزیز ابن بازؒ، مشہور عالم حدیث شیخ ناصر الدین البانیؒ اور بیشتر علماء نے اسے ناجائز قرار دیا، برصغیر میں تو دو چار کو چھوڑ کر سبھوں نے اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا، یہاں تک کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو ایسے مسائل میں متوسع سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے بھی اسے ناجائز ہی کہا، اور بعض اہل علم جو ابتداءً جواز کے قائل تھے، انھوں نے بھی اپنی اِس رائے سے رُجوع کرلیا، جیسے: علامہ سید سلیمان ندویؒ۔

لیکن علماءِ مصر نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا، جن میں علامہ محمد بخیت مطیعی حنفیؒ اور مفتی اعظم مصر حسنین مخلوفؒ سرفہرست ہیں، پھر بیشتر علماءِ عرب نے اسی نقطۂ نظر کو اختیار کرلیا، روایتی کیمرہ کی تصویر کے بعد تصویر کی دنیا میں ایک بڑا انقلاب آیا اور ڈیجیٹل کیمرہ کی ایجاد ہوئی، جس میں الکٹرانک ذرات مل کر کسی چیز کی شکل اختیار کرتے ہیں اور جب انھیں اسکرین سے ہٹا دیا جاتا ہے تو یہ ذرات بکھر جاتے ہیں، پھر دوبارہ ڈیجیٹل آلہ انھیں جمع کرتا ہے، سوال پیدا ہوا کہ کیا اس پر تصویر کا اطلاق ہوگا یا یہ اس عکس کی طرح ہے، جو آئینہ کے سامنے کھڑے ہوتے وقت نظر آتا ہے؟ اس سلسلہ میں اہل علم کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، برصغیر میں علماء کی بڑی تعداد باعتبار فتویٰ کے ابھی بھی اسے حرام کہتی ہے؛ لیکن علماءِ عرب اور برصغیر کے بعض چوٹی کے فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے، کچھ لوگوں نے اسے اس لئے جائز قرار دیا ہے کہ اس پر تصویر کی فقہی تعریف صادق نہیں آتی، اور کچھ لوگوں نے اس نقطۂ نظر سے کہ

موجودہ دور میں یہ ابلاغ کا نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے، جس کا منکرات کی ترویج، مخالف اسلام افکار کی اشاعت اور اسلام اور مسلمان کے خلاف پروپیگنڈوں کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اسلام کی دعوت اور دین حق کے دفاع کے لئے اس کا استعمال کریں، راقم الحروف کے خیال میں برصغیر کے بیشتر علماء نے اسی پہلو کو سامنے رکھ کر اس میں توسع کا راستہ اختیار کیا ہے۔

لیکن بہت سی دفعہ کسی حقیقی ضرورت اور واقعی مجبوری کے تحت جو توسع اختیار کیا جاتا ہے، اس میں شرائط وقیود کی سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں، اور اس کے استعمال میں بے احتیاطی آخری حدیں پار کر لیتی ہیں، تصویر کے معاملہ میں بھی کچھ یہی صورت حال پیدا ہو رہی ہے، اہل سیاست اور اہل دنیا سے کیا شکایت کیجئے کہ ان کے یہاں تو حلال وحرام کی کوئی سرحد ہی نہیں ہے؛ لیکن ان لوگوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جو دینی خدمتیں انجام دیتے ہیں، دینی تعلیمی ادارے چلاتے ہیں، مقتدائے قوم وملت ہیں، اور انھیں شریعتِ اسلامی کا ترجمان سمجھا جاتا ہے کہ ان کے یہاں بھی تصویر کے معاملے میں بڑی بے اعتدالی اور بے احتیاطی کی روش سامنے آ رہی ہے، نیز عوام ان کے قول وفعل کے درمیان ایک تضاد سا محسوس کرتے ہیں۔

اس بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اولاً تو آج بھی اہل علم کی اکثریت ہر طرح کی تصویر کو ناجائز ہی قرار دیتی ہے؛ لیکن اگر ہم ان حضرات کی بات کو قبول کر لیں، جن کے نزدیک ڈیجیٹل فوٹو گرافی پر تصویر کشی کا اطلاق نہیں ہوتا تب بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ روایتی کیمرہ یا ڈیجیٹل کیمرہ سے لی گئی تصویر کاغذ، کپڑے، پلاسٹک کی شیٹ، دیوار، گلاس، اور اس طرح کی چیزوں پر نقش ہو جائے تو پھر اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اب اس کی گنجائش کسی اہم ضرورت ہی کے لئے ہو سکتی ہے، جیسے: پاسپورٹ، ویزا، آدھار کارڈ، اسکول میں ایڈمیشن وغیرہ، یا کسی ملی مصلحت کے لئے جیسے: ریلی اور جلسہ کی تقریر؛ تاکہ یہ بات باور کرائی جائے کہ مسلمانوں یا ہم وطنوں کی بڑی تعداد ہمارے موقف کے ساتھ ہے۔

مگر اب اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پہلے تو اخبار میں خبروں کے ساتھ تصویریں آتی تھیں، اب دینی جلسوں وغیرہ کے اشتہار میں بھی ادارہ کے ذمہ دار اور مقررین کی تصویریں شائع کی جاتی ہیں، پھر یہ جذبہ تشہیر اور آگے بڑھا اور جلسوں کے پوسٹر جن میں صرف تحریر ہوا کرتی تھی، اس میں بھی مقررین کے چہرے چھپنے لگے، پہلے صرف سیاسی پارٹیاں ایسے پوسٹر شائع کرتی تھیں، اب مذہبی تنظیمیں بھی کرنے لگیں، پھر ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بعض علماء اخبارات میں اپنے مضامین اس طرح شائع کرانے لگے کہ اس میں ان کے نام کے ساتھ ساتھ ان کی تصویریں بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہوتی ہیں، بات اس سے بھی آگے نکلی اور دینی حلقہ کے بعض

مصنفین نے اپنی کتابوں کے سرورق پر تصویریں شائع کرنا شروع کر دیں، یا اگر کسی شخصیت پر قلم اُٹھایا، یا کسی صاحبِ علم کا تذکرہ مرتب کیا تو اس پر صاحب تذکرہ کی تصویر طبع کر دی، یہ صورت حال بہت ہی قابل توجہ ہے، قول وفعل کا تضاد بے اعتباری پیدا کرتا ہے، اور علماء کے بارے میں عوام میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں؛ اس لئے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے اور علماء وخواص کو اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کا عمل لوگوں کے لئے سنگ میل کا کام کرتا ہے، اور لوگ ان کو دیکھ کر سفر زندگی کی راہیں متعین کرتے ہیں!!!!

●●●

طلاق اور اس سے پیدا ہونے والے بعض سماجی مسائل

مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی ☆

خاندانی نظام کا استحکام جو بے حد اہم اور اس کے فوائد بہت ہیں، اسی تناسب سے خاندانی نظام کے بکھراؤ اور ٹوٹ جانے سے نقصان بھی ہے اور طلاق اس کا سب سے بڑا سبب ہے، بدقسمتی سے مغربی تہذیب کا بے جا نعرہ شخصی آزادی نے خاندانی نظام کی گرفت کو کمزور کر دیا ہے اور اس کے دباؤ کو ہلکا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے طلاق کے واقعات بڑھ گئے ہیں اور دوسری طرف اخلاقی بے راہ روی، جنسی آزادی اور ناجائز لطف اندوزی نے بھی زخم پر نمک چھڑکنے کا کام کیا ہے کہ دونوں صنفوں کو ایک دوسرے سے بے نیازی کی کیفیت کو فروغ دیا، جس کی وجہ سے بھی طلاق کی شرحوں میں اضافہ ہوا، اس پس منظر میں چند فقہی مسائل پیدا ہوئے ہیں، جن کا حل قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں پیش خدمت ہے۔

ماں باپ کے حکم پر بیوی کو طلاق

آج کل طلاق کے واقعات کے وجوہات جہاں اور بھی ہیں، وہیں اس میں بہت سی دفعہ والدین کا اصرار بھی شامل ہوتا ہے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے؛ لیکن چوں کہ آج کل عام طور پر مسلمانوں میں دین داری کا فقدان ہے، اللہ کا خوف وڈر نہ کہ برابر ہے، ایسی صورت حال میں اس طرح کے واقعات کا رونما ہونا چنداں حیرانی اور تعجب خیز بات نہیں ہے، بہر حال فقہی نقطۂ نظر سے سوال یہ ہے کہ کیا ماں باپ کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ بہو کو ناپسند کرنے کی وجہ سے بیٹے کو مجبور کریں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور کیا بیٹے پر اپنے ماں باپ کی اس بات کو ماننا ضروری ہے؟

ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری کی اہمیت اور اس کا دائرہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماں باپ کا درجہ بہت زیادہ بلند ہے، اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری شریعت اسلامیہ میں مطلوب، فرمان رسول ﷺ اور حکم خدا ہے، فرمانبردار اولاد مستحق اجر وثواب اور نافرمان مستحق سزا وعقاب ہیں؛

☆ عمید کلیۃ البحث والتحقیق: جامعۃ العلوم گڑھا، گجرات۔

البتہ شرعی اعتبار سے اس کا تعلق مباح کاموں سے ہے، اگر ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دیں، یا کسی ایسے کام کا حکم کریں، جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آئے، تو وہاں ماں باپ کی بات ماننا اولاد پر لازم نہیں ہے؛ بلکہ باعث گناہ اور شرعاً ناجائز ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دینے کے بعد فرمایا :

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ (لقمان:۱۵)

اور اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ، جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں، تو تم ان کی بات مت مانو اور بہتر طور پر دنیا میں ان کے ساتھ رہو۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آئے وہاں کسی کی اطاعت جائز نہیں، اطاعت تو صرف بھلی باتوں میں ہے''(۱) نیز اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ کی نافرمانی کرے اس کی اطاعت نہیں''(۲) ایک موقع سے مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی صورت میں کسی انسان کی بات قابل اطاعت و مسموع نہیں''(۳) ایک اور موقع سے مزید صراحت کے ساتھ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت روا نہیں''۔(۴)

جہاں تک رہی بات ماں باپ کا بیٹے کو حکم کرنا، یا مطالبہ کرنا یا اسے مجبور کرنا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے، تو بنیادی طور پر اس کی دو صورتیں ہوں گی :

پہلی صورت: اور وہ یہ ہے کہ ماں باپ دونوں، یا دونوں میں سے کوئی ایک بغیر کسی شرعی عذر اور معقول وجہ کے بیٹے سے مطالبہ کریں یا اسے مجبور کریں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے، ایسی صورت میں بیٹا ماں باپ کا کہنا نہیں مانے گا اور اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے گا؛ اس لئے کہ بغیر کسی شرعی سبب کے بیوی کو طلاق دینا حرام اور گناہ کبیرہ ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک، حسن معاشرت، بہتر برتاؤ اور معروف و بھلے طریقے پر زندگی بسر کرتے رہیں۔(۵)

(۱) مسلم، باب وجوب طاعۃ الأمراء، حدیث نمبر:۳۹-۱۸۴، بخاری، باب فی اجازۃ خبر الواحد الصدوق، حدیث نمبر:۷۲۵۷۔
(۲) ابن ماجہ، جہاد، باب لا طاعۃ فی معصیۃ اللہ، حدیث نمبر:۲۸۶۵۔
(۳) صحیح ابن حبان، عن علیؓ، حدیث نمبر:۴۵۶۸-۴۵۶۹۔
(۴) مجمع الزوائد، باب لا طاعۃ فی معصیۃ، حدیث نمبر:۹۱۴۳۔
(۵) النساء:۱۹، الاحزاب:۳۷۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو طلاق کے اقدام سے پہلے افہام وتفہیم اور بعض حکیمانہ تدابیر اختیار کرنے کا حکم فرمایا؛ تاکہ طلاق واقعات کم سے کم پیش آئیں، (۱) اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ ان مرحلہ وار تدابیر کے ذکر کے بعد قرآن خاموش ہے، طلاق کا حکم نہیں دیا ہے، جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ اس کے باوجود شوہر صبر وضبط سے کام لے اور اس کو طلاق دے کر رُخصت کرنے کے بجائے اس کے ساتھ نباہ کی کوشش کرے تو بہتر ہے، گو اس کے لئے اس کے بعد طلاق دینا شرعاً روا وگنجائش ہے۔

دیکھئے: اللہ تعالیٰ نے مرد کو حکم دیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہوسکے عورت کے ساتھ حسن معاشرت اور معروف وبھلے طریقہ پر زندگی بسر کرتے رہو، ایسا کرنا تقویٰ اور نیک کاموں میں سے ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ ۔ (۲)
>
> اور جب آپ اس شخص کو — جس کو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے انعام سے نوازا ہے اور آپ نے بھی اس پر کیا ہے — کہہ رہے تھے کہ ''تم اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو اور اللہ سے ڈرو''۔

اور چوں کہ بلاسبب شرعی عورت کو طلاق دینا جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہے وہیں عورت کو بلا قصور تکلیف پہنچانا اسے مشقت میں مبتلا کرنا اور مشکلات سے دوچار کرنا ہے اور بڑے حرج ومشقت میں ڈالنا ہے اور ایسا کرنا حرام ہے؛ اس لئے کہ تعالیٰ نے شوہروں سے مخاطب ہوکر فرمایا: ''وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ'' (۳) ''اور ان کو تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ پہنچاؤ'' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر بڑے سخت لب ولہجہ میں ارشاد فرمایا :

> وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔ (۴)
>
> محض ان کو نقصان پہنچانے کے ارادہ سے — کہ زیادتی کرتے ہو — ان کو نہ روکو، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتا ہے۔

---

(۱) النساء: ۳۴-۳۵۔

(۲) الاحزاب: ۳۷۔

(۳) الطلاق: ۶۔

(۴) البقرۃ: ۲۳۱۔

اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ اس آیت میں ''تو بہتر طریقہ پر ان کو روک رکھو یا بھلے طریقہ پر چھوڑ دو''(۱) بھی ارشاد فرمایا اور دوسری آیتوں میں بڑی تاکید کے ساتھ حسن معاشرت اور بھلے طریقہ پر زندگی گذارنے کا حکم فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''**فَإِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوفٍ**''(۲) ''تو بھلے طریقہ پر روک رکھنا ہے''، ''**وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلۡمَعۡرُوفِ**''(۳) ''توان کے ساتھ اچھی طرح گذر بسر کرو''، ''**فَأَمۡسِكُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ**''(۴) ''توان کو بہتر طریقہ پر روک رکھو''۔

ذخیرہ احادیث میں عورت کے ساتھ حسن سلوک، نرم برتاؤ، بہتر رویہ، رحیمانہ معاملہ، کریمانہ اخلاق واطوار اور حسن معاشرت کے بارے میں بکثرت ہدایات وتعلیمات ملتی ہیں اور سیرت پاک ﷺ میں ازواج مطہرات کے ساتھ حسن معاشرت اور خوشگوار رویے کے انمول نمونے ملتے ہیں؛ چنانچہ ایک سفر میں آپ ﷺ نے اپنے خادم انجشہؓ جو عورتوں کی اونٹنیوں کو ہنکانے پر مامور تھے، سے فرمایا: ''اے انجشہ آہستہ بھگاؤ، ان آبگینوں پر رحم کھاؤ'' ایک روایت میں آیا ہے کہ ''آبگینوں کو نہ توڑو''۔(۵)

نیز رسول اللہ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ بھلائی کا حکم فرمایا؛ کیوں کہ عورتوں کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے، وہ بھی اوپر کی پسلی، وہ تو اور ہی ٹیڑھی ہوتی ہے؛ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو ٹیڑھی پسلی سے تشبیہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> اگر تم اس کو سیدھی کرنے میں لگے تو اس کو توڑ ڈالوگے، اگر تم نے اس کو اپنے حال پر اسی طرح چھوڑ دیا تو وہ برابر ٹیڑھی ہی رہے گی، اگر تم اس سے متمتع اور لطف اندوز ہوتے رہنا چاہتے ہو تو اسی ٹیڑھی حالت میں اس سے لذت اُٹھاتے رہو، اگر اس کو سیدھی کرنے میں لگے تو یاد رکھو، اس کو توڑ ڈالوگے اور اس کو توڑنا اس کی طلاق ہے، (یعنی طلاق دینے کی نوبت آجائے گی اور بالآخر تو اس کو طلاق دیدوگے)۔(۶)

معلوم ہوا کہ عورت کے ساتھ حد سے زیادہ سختی ثمر آور ہونے کے بجائے غیر مفید اور بے سود ہوتی ہے اور دن گذرنے کے ساتھ ازدواجی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں اور روز افزوں نت نئی روپ میں مزید مشکلات سے شوہر کو

(۱) البقرۃ:۲۳۱۔ (۲) البقرۃ:۲۲۹۔
(۳) النساء:۱۹۔ (۴) الطلاق:۲۔
(۵) بخاری، حدیث نمبر:۶۱۶۱، ۶۲۰۹، ۶۲۱۱، مسلم، حدیث نمبر:۰۷-۲۳۲۳۔
(۶) مسلم، باب الوصیۃ بالنساء، حدیث نمبر:۵۹-۱۴۶۸، بخاری، باب الوصاۃ بالنساء، حدیث نمبر:۵۱۸۵-۵۱۸۶۔

گذرنا پڑتا ہے؛اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی اُمت کے مردوں کوعورتوں کے ساتھ ممکن حدتک حسن معاشرت اورخوش اُسلوبی کے ساتھ گذر بسر کرنے کا حکم فرمایا، بڑی اچھوتی مثال سے سمجھایا کہ عورتیں آبگینہ ہیں،جس طرح آبگینہ خوش نظر ہونے کے ساتھ بڑے نازک ہوتے ہیں،زورزبردستی،زورآزمائی اور بےڈھنگ سلوک ان کے لئے ناقابل تحمل ہوتے ہیں؛اس لئے بسااوقات وہ معمولی بےاحتیاطی سے پھوٹ کردم توڑ دیتے ہیں،یہی حال عورتوں کا ہے،خوش شکل، جاذب نظراورفرحت بخش اداؤں کے ساتھ بڑی نازک مزاج اورجذبات سے لبریز ہوتی ہیں؛ اس لئے ان کے ساتھ بے جاسختی مرد کے لئے مشکلات کا پیش خیمہ اورخوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے رخنہ اورسم قاتل ہے؛اس لئے آپ ﷺ نے شریک حیات کے ساتھ نرم رویہ اختیارکرنے کا حکم فرمایااورترغیب دیتے ہوئے فرمایا:''لوگوں میں سب سے بہتر اخلاق والے وہ لوگ ہیں، جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والے ہوں''(۱)اورخوداپنی ذات کوبطورنمونہ پیش فرمایااورارشادفرمایا:''دیکھو!میں تم لوگوں میں اپنی گھر والیوں کے ساتھ بہترسلوک کرنے والا ہوں''۔(۲)

نیز نبی کریم ﷺ نے مردوں کوعورتوں طلاق دینے سے دُور رکھنےاورطلاق سےنفرت پیدا کرنے کی غرض سے مزیدارشادفرمایا:''اللہ تعالیٰ کے یہاں حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض وناپسندیدہ شئے طلاق ہے''۔(۳)

اور چوں کہ طلاق کی وجہ سےعورتیں بڑی مشکلات اوردشواریوں سے دوچار ہوتی ہیں،اوردورِحاضر میں جہاں دوسری شادی ایک خواب سمجھی جاتی ہے،کبھی خواب شرمندۂ تعمیر ہوتا ہےاورکبھی نہیں ہوتا ہےاوربعض علاقوں میں شرمندۂ تعبیر ہونا محال معلوم ہوتا ہےاور جوانی کی آرزوئیں دلوں میں بجھ کررہ جاتی ہیں،بعض مرتبہ شیطان کا جادوچل جاتا ہےتوانسانی معاشرہ بھی پراگندہ ہونے لگتا ہے؛اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:''لا ضرر ولا ضرار''(۴)یعنی جس طرح خودانسان ضررکواپنے لئے پسندنہیں کرتا ہےاورنہ ہی برداشت وگوارہ کرنا چاہتا ہے،اسی طرح دوسرے کوبھی ضررنہیں پہنچانا چاہئے،نہ ہی پہنچانے کااقدام ابتداءً کرےاورنہ ہی انتقام کے طور پر،

---

(۱) ترمذی،عن ابی ہریرۃؓ،رضع،باب حق المرأۃ علی زوجہا،حدیث نمبر:۱۱۲۲،امام ترمذی کا بیان ہے:یہ حدیث حسن صحیح،مستدرک حاکم،بروصلہ،حدیث نمبر:۲/۷-۳۷،حاکم کا بیان ہے:اورحافظ ذہبیؒ نے حاکم کی موافقت کرتے ہوئےلکھا ہے:حدیث صحیح۔

(۲) ترمذی،المناقب،باب فی فضل أزواج النبی ﷺ،حدیث نمبر:۳۸۹۵،صحیح ابن حبان،حدیث نمبر:۴۱۷۷۔

(۳) ابوداؤد،الطلاق،باب کراھیۃ الطلاق،حدیث نمبر:۲۱۷۷۔

(۴) مؤطاامام مالک،الأضیۃ،باب الأقضیۃ فی المرافق،حدیث نمبر:۲۲۶،ابن ماجہ،الأحکام،باب من بنی فی حقہ ما یضر جارہ،حدیث نمبر:۲۳۴۰،مستدرک حاکم،بیوع:۲/۵۷،دارقطنی،الأقضیۃ والأحکام:۴/۲۲۸۔

فقہاء نے اسی حدیث کے پیش نظر کئی قاعدے وضع کئے ہیں: ''الضرر یزال''، ''الضرر لایزال بالضرر''(۱) یعنی ضرر کو دُور کرنا چاہئے اور دُور کیا جائے؛ لیکن کسی دوسرے کو ضرر پہنچا کر اپنا ضرر دُور نہ کیا جائے، تیسرا قاعدہ: ''لو کان احدھما اعظم ضرراً من الآخر ؛ فإن الاشد یزال بالأخف''(۲) یعنی اگر ضرر کو دُور کرنا ناگزیر ہو تو اُصول یہ ہے کہ دفع ضرر کے اقدام سے پہلے دیکھ لیا جائے کونسا ضرر بڑا ہے اور کونسا چھوٹا ہے، اس کے بعد چھوٹے ضرر کو انگیز و برداشت کرتے ہوئے بڑے ضرر سے بچا جائے۔

اور چوں کہ نکاح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے اور کفرانِ نعمت حرام ہے، اور یہاں کفرانِ نعمت مسنون نکاح کے بندھن کو توڑنا ہے۔(۳)

فقہی قاعدہ ہے: ''ماحرم فعله حرم طلبه''(۴) یعنی شرعاً جس عمل کا کرنا ممنوع وحرام ہو تو اس کا کسی دوسرے سے کرنے کا مطالبہ کرنا بھی ممنوع وحرام ہے؛ لہٰذا جیسا کہ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ بغیر کسی سبب شرعی کے عورت کو طلاق دینا ناجائز وحرام ہے، تو بغیر شرعی عذر کے والدین کا اپنے بیٹے سے بہو کو طلاق دینے کا مطالبہ کرنا بھی ناجائز وحرام ہوگا؛ اسی وجہ سے اس عورت کے بارے میں بڑی سخت وعید آئی ہے جو بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس عورت پر جنت کی خوشبو حرام ہے''(۵) ایک روایت میں ہے کہ: ''وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گی''۔(۶)

اوپر ذکر کردہ نصوص وتصریحات سے واضح ہوگیا کہ بغیر سبب شرعی کے والدین کا اپنے بیٹے سے مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے، تو والدین ظالم شمار ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ظالم کو پسند نہیں کرتا،(۷) فقہاء کا بیان ہے کہ کہ

(۱) الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۱/ ۸۶-۸۸۔
(۲) الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۱/ ۸۹۔
(۳) المبسوط للسرخسی، کتاب الطلاق: ۶/۲۔
(۴) الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۱/ ۱۵۵۔
(۵) ابوداؤد، الطلاق، باب فی الخلع، حدیث نمبر: ۲۲۲۶، ترمذی، باب فی المختلعات، حدیث نمبر: ۱۱۸۷، امام ترمذی کا بیان ہے: یہ حدیث حسن ہے، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۰۵۵، صحیح ابن حبان، ذکر تحریم اللہ جل وعلا الجنۃ علی السائلۃ طلاقہا زوجہا من غیر سبب یوجب ذلک، حدیث نمبر: ۳۱۸۴، مستدرک حاکم، الطلاق، حدیث نمبر: ۲۸۰۹، حاکم کا بیان ہے: ''ہذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین، ولم یخرجاہ، حافظ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی۔
(۶) ترمذی، باب فی المختلعات، حدیث نمبر: ۱۱۸۶۔
(۷) آل عمران: ۵۷۔

ناحق کسی کو مجبور کرنا صرف حرام ہی نہیں ہے؛ بلکہ گناہ کبیرہ بھی ہے؛ کیوں کہ یہ ظلم ہے،(۱) حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کیا اور تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا، پس تم لوگ آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو''۔(۲)

نیز خاندانی شیرازہ کو بکھیرنا، بسا بسایا گھر کو اُجاڑنا، پیار و محبت اور اُلفت و مودت کے ماحول کو پراگندہ کرنا اور سجے سجائے گھر کو یکلخت منتشر کرنا لازم آئے گا، جس سے شیطان خوش ہوگا اور اللہ ناراض ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ بلا وجہ طلاق دینا جہاں شریعت اسلامیہ کے مقصد کے خلاف ہے وہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی ہے؛ اس لئے یہ گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کے کاموں میں ماں باپ کی بات ماننا درست نہیں؛ بلکہ مزید گناہ ہے اور ماں باپ بھی گنہگار ہوں گے؛ بلکہ بیٹے کو طلاق دینے پر مجبور کرنے کی صورت میں ظالم شمار ہوں گے اور ظلم گناہ کبیرہ ہے،(۳) اور اللہ تعالیٰ ظالم کو پسند نہیں کرتا ہے،(۴) اس کے باوجود اگر کسی بیٹے نے ماں باپ کی بات مانی اور بیوی کو طلاق دیدی تو طلاق واقع ہوگئی اور وہ اپنے اوپر اور اپنی بیوی پر ظلم کرنے والا ٹھہرا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی اور وہ گنہگار ہوا؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی نافرمانی کی صورت میں باپ کی بات ماننے سے روکا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۔ (۵)

اور اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ، جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، تو تم ان کا کہا نہیں مانو۔

پیچھے ایک سے زائد حدیثیں گذر چکی ہیں، جن میں اس کی بات کی صراحت ہے کہ اللہ کی معصیت کے موقعوں پر کسی بشر کی اطاعت جائز نہیں، خواہ حکم دینے والا میر و بادشاہ ہو، یا والی و حاکم، یا استاذ و پیر، یا ماں باپ کیوں نہ ہو۔

---

(۱) موسوعہ فقہیہ کویت: ۱۰۱/۶۔

(۲) مسلم، البر والصلۃ، باب تحریم الظلم، حدیث نمبر: ۵۵-۲۵۷۷۔

(۳) موسوعہ فقہیہ کویت: ۱۰۱/۶۔

(۴) آل عمران: ۵۷۔

(۵) لقمان: ۱۵۔

دوسری صورت: اور وہ یہ ہے کہ ماں باپ یا ان دونوں میں سے کسی ایک کا بیٹے سے بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرنا حق بجانب اور شرعی عذر کی بنیاد پر ہو، اس طور پر کہ بیوی بدچلن ہے، یا بدزبان ہے، فرض نمازوں کی پابندی نہیں کرتی ہے، بار بار سمجھانے کے باوجود سدھرنے کا نام نہیں لیتی ہے، ہر طرح کی پند ونصائح بے اثر ثبت ہوچکی ہیں، اس کے باوجود بیٹے پر ماں باپ کے مطالبہ کو قبول کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دینا واجب نہیں ہے اور اس معاملہ میں ماں باپ کی اطاعت اور کہنا نہ ماننے کی وجہ سے نافرمان نہیں کہلائے گا اور نہ ہی وہ گنہگار ہوگا؛ کیوں کہ بیوی کو طلاق دینا ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کے قبیل سے نہیں ہے، جیسا کہ امام حسن بصریؒ امام احمد بن حنبلؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، علامہ شوکانیؒ اور ماضی قریب کے مفتی عثیمینؒ کا فتویٰ ہے، (۱) یہی حنابلہ کا مذہب ہے، (۲) شرعی نصوص ودلائل کی روشنی میں یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل سے بات آچکی ہے، مزید برآں دیکھا جائے تو یہ اسلامی روح مقاصد شریعت اور مصالح نکاح سے قریب وہم آہنگ ہے، اللہ کی رضا ومنشاء اور قیامت کے روز منظر رسول ﷺ سے قریب تر ہے، خاندانی شیرازی بندی کو تقویت ملتی ہے، خاندان بکھیرنے اور انتشار کا شکار ہونے سے محفوظ رہتا ہے، بچے لاوارث اور اوباش بننے سے بچتے ہیں، بچوں کو ماں باپ کا پیار ملتا ہے اور ان کی زندگی سنورتی بنتی ہے۔

جہاں تک نصوص شرعیہ کی بات ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (۳)

اے ہمارے ایمان والو! تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے مالک بن بیٹھو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کو روکے رکھو؛ تاکہ اپنے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ

---

(۱) البر والصلة لأبي عبد الله الحسين المروزي المتوفى: ۲۴۶ھ، ص: ۳۲، الفروع: ۹/ ۷، المبدع في شرح المقنع: ۶/ ۲۹۳، الآداب الشرعیہ والمنح المرعیۃ لابن مفلح الحنبلی: ۱/ ۵۰۳، الزواجر: ۲/ ۷۲، مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ: ۳۳/ ۱۱۳، نیل الأوطار للشوکانی: ۶/ ۲۶۲، شرح ریاض الصالحین للعثیمین: ۳/ ۲۰۳۔

(۲) الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف: ۸/ ۴۳۱۔

(۳) النساء: ۱۹۔

وصول کرلو، سوائے اس کے کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کریں اور ان کے
ساتھ اچھی طرح گذر بسر کرو، اگر وہ تم کو نہیں بھاتی ہیں، تو ہوسکتا ہے تم کو ایک چیز
ناپسند ہو اور اللہ نے اسی میں بہت سی خوبیاں رکھی ہوں۔

غور وفکر کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت بالا میں شوہروں سے نہ مطالبہ کیا اور نہ ہی حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دیدیں؛ جب کہ ان کی بیویاں ان کو ناپسند ہوں، یہاں تک کہ بدچلن ہوں، اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک صحابی دربار نبوت میں حاضر ہوتے ہیں اور عرض کناں ہوتے ہیں: اے اللہ کے رسول ﷺ! میری بیوی بدچلن ہے کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو طلاق دے دو'' اس صحابی نے عرض کیا: میں اس سے محبت کرتا ہوں، وہ خوبصورت ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو اس کو روکے رکھو اور اس سے متمتع ہو'' (۱) معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس صحابی پر بیوی کو طلاق دینا فرض و واجب قرار نہیں دیا باوجودیکہ وہ بدچلن تھیں اور بدچلن ہونا عذر شرعی ضرور ہے، جس کی وجہ سے شرعاً بیوی کو طلاق دیا جائز ہے؛ لیکن فرض و واجب نہیں ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت وحدیث سے معلوم ہوتا ہے؛ بس اگر کوئی شخص عذر شرعی پائے جانے کے باوجود اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیتا ہے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا، اس کی مرضی، چاہے تو طلاق دے سکتا ہے اور اگر چاہے تو طلاق نہ دے کر اس کے ساتھ زندگی گذارنے کا ارادہ کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے، جیسا کہ اوپر کی حدیث میں ذکر ہوا، نیز ایک اور حدیث ہے، حضرت لقلیط بن صبرہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک چرواہے نے اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میری ایک بیوی ہے، اس کی زبان میں کچھ ہے، یعنی قدرے بدزبان ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''تو اس کو طلاق دے دو'' اس صحابی نے فرمایا: اس سے میری صحبت ہے، اس سے میری اولاد بھی ہیں، تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''زبان سے اس کو کہو اور اس کو نصیحت کرو، شاید کہ اس کی سمجھ میں بات آجائے''۔(۲)

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیهقی، نکاح، حدیث نمبر: ۱۳۸۳، السنن الصغریٰ له، حدیث نمبر: ۲۴۳، معرفة السنن والآثار له، حدیث نمبر: ۱۳۷۶۶، اعتلال القلوب للخرائطی، نکاح، حدیث نمبر: ۵۴۱، ۵۷۲، مسند الشافعی ترتیب السندی، حدیث نمبر: ۱۲۰۶۔

(۲) صحیح ابن حبان، باب فی الخلافة والامارة، حدیث نمبر: ۴۵۱۰، مستدرک حاکم، الأطعمة، حدیث نمبر: ۷۰۹۴، حاکم کا بیان ہے: هذا حدیث صحیح الاسناد، ولم یخرجاه، حافظ ذہبیؒ نے موافقت کی، ابوداؤد، الطهارة، باب فی الاستنشاق، حدیث نمبر: ۱۳۲، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۶۳۸۴، ۱۷۸۴، مصنف عبدالرزاق: ۲۶/۱، حدیث نمبر: ۸۰۔

نیز طلاق کوئی پسندیدہ مرغوب اور لطف اندوز ہونے کی شئے نہیں ہے؛ بلکہ ایک مبغوض شئے اور کفرانِ نعمت ہے، ایسا اس لئے کہ نکاح اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کی سنت ہے؛ اسی وجہ سے بیوی کو طلاق نہ دینا اصل ہے، حتیٰ الامکان نباہ کی کوشش کرنی ہے، نباہ کے تمام راستے جب بند ہوجائیں اور عورت سے خلاصی ناگزیر اور ایک اشد ضرورت بن جائے تو ایسے وقت میں عورت کو طلاق دینا مباح ہے۔(۱)

غور وفکر کا مقام ہے کہ آج کل کے معاشرہ میں مفاد پرستی کا غلبہ ہے، حریصانہ مطالبات، خدمت کا مبالغہ آمیز تصور اور بہو سے نوکرانی کی طرح کام لینے کا مزاج عام ہے، اس پس منظر میں ماں باپ کی طرف سے بہو کو طلاق دینے کا مطالبہ بے جا ہی ہوتا ہے۔

زیر بحث مسئلہ میں بیوی کو طلاق دینا ایک اشد ضرورت کی شکل اختیار نہیں کیا ہے؛ پس ماں باپ کی بات مانتے ہوئے بیوی کو طلاق دینا شرعاً جائز نہیں ہوگا، گو ماں باپ کا مطالبۂ طلاق برحق ہو، ملا علی قاریؒ ابن حجرؒ سے نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں، ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں بیوی کو طلاق دینا، بیٹے پر لازم نہیں، گو گھر میں اس کے رہنے کی وجہ سے ماں باپ بڑی اذیت وکوفت سے دوچار ہوں، اس لئے کہ طلاق دینے کی وجہ سے عورت کو بڑا ضرر پہنچے گا؛ پس ماں باپ کو اذیت کا خیال رکھتے ہوئے بیٹے کو بہو کو طلاق دینے کا مکلف نہیں بنایا جائے گا، ماں باپ کی شفقت کا تقاضا یہ تھا کہ اذیت برداشت کرلیتے؛ لیکن بیٹے کو حکم نہیں کرتے کہ تم اپنی بیو کو طلاق دے دو، (۲) غور کرنے کی بات ہے کہ طلاق کی وجہ سے بہو جن پریشانیوں اور نقصانوں سے دوچار ہوگی وہ بھی ہندوستان کے پس منظر میں ناقابل بیان ہے، اگر اس سے بچے ہیں تو وہ برباد ہوں گے اور بیٹا بھی ذہنی تناؤ، دماغی اُلجھن اور جذباتی پریشانی سے دوچار ہوگا، ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے غور کیا جائے تو طلاق کا ضرر اذیت ماں باپ کی اذیت و پریشانی سے کئی گنا بڑھا ہوا ہے، فقہ اسلامی کا اُصول وضابطہ یہ ہے کہ جب دو ضرر جمع ہوجائیں تو چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جائے گا اور بڑے ضرر سے بچا جائے گا: ''لو كان احدهما اعظم ضرراً من الآخر ؛ فإن الاشد يزال بالأخف''۔(۳)

زیر بحث صورت میں اگر بیٹے نے پنی بیوی کو طلاق دے دی تو طلاق پڑ جائے گی اور بیٹا شریعت اسلامیہ کی نگاہ میں گنہگار اور خلافِ شرع کام کرنے والا نہیں کہلائے گا؛ اس لئے کہ یہاں شرعی عذر موجود ہے، جیسا کہ

(۱) المبسوط للسرخسی، کتاب الطلاق: ۶/۲، ہدایہ: ۲۲۱/۱، بدائع الصنائع: ۹۷/۳، رد المحتار: ۲۸/۴۔

(۲) مرقاۃ المفاتیح: ۱۳۳/۱۔ (۳) الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۸۹/۱۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کیا؛ کیوں کہ ان کی شریک حیات بدزبان تھیں یا اس میں دینی نقص پایا جاتا تھا،(۱) علامہ ابن نجیم مصریؒ کا بیان ہے: ''شوہر پر بدکار بیوی کو طلاق دینا واجب نہیں ہے اور نہ ہی عورت پر بدکار شوہر کو چھوڑنا لازم ہے، ہاں، جب دونوں اللہ کے مقرر کردہ حدود کو قائم رکھنے کی بابت خوف کھاتے ہوں، تو باہم دونوں ایک دوسرے جدا ہوجائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔(۲)

حاصل بحث یہ ہے کہ دوسری صورت میں بیٹے پر ماں باپ کی بات طلاق دینے کی ماننا ضروری اور واجب نہیں ہے؛ بلکہ اختیار ہے، چاہے بیوی کو بھلے طریقہ پر روک رکھے، یا خوش اُسلوبی کے ساتھ رُخصت کردے، شرعاً اس کے لئے گنجائش ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے جو بھی صورت چاہے اختیار کرسکتا ہے۔

اس مسئلہ میں ستائیسواں فقہی سیمینار منعقدہ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ، مطابق نومبر ۲۰۱۷ء ممبئی کی تجاویز یہ ہیں :

> طلاق کو شریعت نے ابغض المباحات قرار دیا ہے؛ لہٰذا حتیٰ الامکان اس سے گریز کرنا چاہئے اور صرف اسی وقت طلاق کا راستہ اختیار کرنا چاہئے، جب کہ زوجین کے درمیان باہم نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہ جائے؛ لہٰذا یہ درست نہیں ہے کہ والدین اپنی ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے بیٹے کو مجبور کریں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور بیٹے پر والدین کی ایسی بات ماننا ضروری نہیں ہے۔

عدت کے بعد سابق شوہر پر مطلقہ عورت کیلئے نفقہ کا حکم

گو اس وقت سرکاری عدالتوں سے مطلقہ کے لئے نفقہ کا فیصلہ ہورہا ہے، ظاہر ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے مطلقہ کے لئے صرف عدت ہی کا نفقہ سابق شوہر پر واجب ہوتا ہے، خواہ مطلقہ رجعیہ ہو، یا بائنہ: ایک ہو یا دو یا تین، اسی طرح خواہ مطلقہ حمل سے ہو یا نہ ہو۔(۳)

---

(۱) نیل الأوطار للشوکانی: ۶/ ۲۶۲، بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد للشیخ خلیل احمد السہارنفوری: ۱۳/ ۵۲۶۔

(۲) البحر الرائق: ۳/ ۱۱۵، الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۱/ ۸۹۔

(۳) دلائل کے لئے دیکھئے: سورۂ طلاق: ۱، ۶، تفسیر سمرقندی: ۳/ ۴۶۲، احکام القرآن للجصاص: ۳/ ۶۱۳ - ۶۱۵، مفاتیح الغیب للرازی: ۶/ ۵۳۴، تفسیر الماتریدی لأبی منصور الماتریدی: ۱۰/ ۶۶، الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۱۸/ ۱۶۸، بخاری طلاق، باب قصة فاطمة بنت قیس، حدیث نمبر: ۵۲۲۳، شرح معانی الآثار للطحاوی، حدیث نمبر: ۴۵۲۲، ۴۵۲۳، مصنف عبدالرزاق، باب عدة الحبلی ونفقتھا: ۷/ ۲۴، حدیث نمبر: ۱۳۲۷، نصب الرایہ للزیلعی: ۳/ ۲۷۳، ۲۷۴، الدرایة لابن حجر: ۲/ ۸۳، بدائع الصنائع: ۳/ ۲۱۰، ردالمحتار: ۳/ ۶۰۹، موسوعہ فقہیہ کویت: ۱۶/ ۲۷۴، ۴۱/ ۵۷، فقہ السنة للسید سابق: ۱۸۲۔

نیز واضح رہے کہ عدت گذرنے کے بعد سابق شوہر پر مطلقہ کا نفقہ واجب نہیں ہوتا ہے، اس پر تمام فقہاء اور علماءِ اُمت کا اتفاق ہے؛ اس لئے کہ میرے کوتاہ علم کے مطابق اس مسئلہ میں کسی فقیہ مجتہد کا اختلاف نہیں ہے، اگر کوئی مطلقہ عورت کی عدت گذرنے کے بعد سابق شوہر پر نفقہ واجب قرار دیتا ہے اور اس بات کا قائل ہے، تو وہ قول باطل اور ناقابل التفات ہے؛ کیوں کہ نص کے خلاف قیاس و اجتہاد کا اعتبار نہیں؛ چنانچہ فقہاء نے اس بات کو ایک فقہی قاعدہ کے طور پر ذکر کیا ہے: ''لا عبرة بالقياس فى مقابلة النص أو الاجماع بالاتفاق''(۱) ''لا مجال للقياس فى مقابلة النص''(۲) ''لا مساغ للاجتهاد فى مورد النص''(۳) الفاظ کے تقارب کے ساتھ ان تینوں قواعد کا حاصل یہ ہے کہ کسی منصوص مسئلہ کا مصنوص حکم کو چھوڑ کر کسی اور حکم سے استخراج کے لئے عقل ورائے کی بنیاد پر اجتہاد اور قیاس کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی اعتبار ہے، اسی طرح جب کسی حکم شرع پر اجماع منعقد ہو جائے تو اس کے بعد اس کے خلاف کوئی نیا حکم بیان کرنا جس کی بنیاد قیاس واجتہاد ہو، صحیح نہیں ہے اور نہ ہی وہ معتبر ہے۔

مذکورہ بالا قواعد کی تائید نصوص سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (۴)

جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مسلمان مرد یا عورت کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں رہتا اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ کھلے طور پر گمراہ ہو گیا۔

امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جس وقت حضرت معاذ بن جبلؓ کو اہل یمن کے لئے قاضی ومعلم بنا کر یمن روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا: تو اس وقت ان سے دریافت فرمایا :

---

(۱) شرح التلویح علی التوضیح للتفتازانی (المتوفی: ۷۹۳ھ): ۲/۱۶۳، المعتمد فی اُصول الفقہ لابی الحسن البصری المعتزلی: ۲/۱۷۵، کشف الاسرار للبخاری الحنفی: ۳/۲۶، شرح القواعد الفقہیۃ للزرقاء (المتوفی: ۱۳۵۷ھ) ص: ۱۴۷۔

(۲) تیسیر التحریر: ۳/۱۷۱۔

(۳) شرح القواعد الفقہیۃ للزرقاء: ۱۴۷، الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہ الکلیۃ: ۱/۳۸۳۔

(۴) الاحزاب: ۳۶۔

جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ فیصلہ کے لئے پیش ہوگا تو کیسے فیصلہ کروگے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا: اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا، اس کے بعد آپ ﷺ نے پوچھا: اگر اس کا حکم کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ نے جواب دیا: رسول ﷺ کی سنت سے فیصلہ کروں گا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا: اگر تم کتاب اللہ اور نہ ہی سنت رسول میں اس کا حکم پاؤ تو؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا: میں اپنی طاقت بھر اجتہاد کروں اور اس میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھوں گا، رسول ﷺ نے ان کے سینہ پر (ہاتھ) مارا اور فرمایا: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے رسول کے قاصد کو ایسی بات کی توفیق بخشی جو رسول اللہ کو خوش کردے۔(۱)

عدت کے بعد نفقہ کیلئے عدالت سے رُجوع

اس وقت انڈین عدالتوں سے مطلقہ کے لئے نفقہ کا فیصلہ ہو رہا ہے کہ سابق شوہر پر اس وقت تک نفقہ دینا واجب ہوگا، یہاں تک اس کا انتقال ہوجائے یا وہ دوسری شادی کرلے، ظاہر ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے صرف عدت ہی کا نفقہ سابق شوہر پر واجب ہوتا ہے، جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے، تو کیا مطلقہ کے لئے بعد از عدت نفقہ کے لئے عدالت سے رُجوع کرنا شرعاً درست ہے؟

جہاں تک عدت گذرنے کے بعد نفقہ سابق شوہر سے مطالبہ کرنے، اس کا وصول کرنے، اس کے لئے عدالت سے رُجوع کرنے کی بات ہے تو ایسا کرنا عورت کے لئے جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ عدت کے بعد نفقہ چوں کہ سابق شوہر پر شرعاً لازم نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے اس مقصد کے لئے عدالت سے رُجوع کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ وہ باطل ناجائز طریقہ سے نفقہ حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے منع کیا ہے، (۲) ایسی عورت جو عدت کے بعد کا نفقہ سابق شوہر سے وصول کرنے کے لئے سرکاری عدالت سے رُجوع ہوتی ہے تو وہ سخت گنہگار ہوگی؛ اس لئے کہ وہ اللہ کے فیصلہ کو ماننے سے روگردانی کررہی ہے اور سیدھے راستہ کو چھوڑ کر باطل وگمراہی کا راستہ اپنا رہی ہے اور قانون الٰہی کو اپنے اوپر نافذ کرنے سے بھاگ رہی ہے، ایسا کرنے والے کے حق میں بڑی سخت وعید وارد ہوئی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

(۱) ابوداؤد، الأقضیۃ، باب اجہاد الرأی فی القضاء، حدیث نمبر: ۳۵۹۲، ترمذی، الاحکام، باب فی القاضی کیف؟ حدیث نمبر: ۱۳۲۷، ۱۳۲۸۔

(۲) البقرۃ:۱۸۸، النساء:۲۹۔

● فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔(۱)

پس آپ کے پروردگار کی قسم! وہ تو مومن ہو ہی نہیں سکتے، جب تک اپنے آپسی جھگڑوں میں آپ کو حکم نہ بنائیں، نیز آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔

● وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔ (۲)

جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کسی بات فیصلہ کر دیں تو کسی مسلمان مرد یا عورت کو ان کے اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں رہتا اور جس نے اللہ اور اس رسول کی نافرمانی کی، وہ کھلے طور پر گمراہ ہو گیا۔

● تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۳)

یہ اللہ کی (قائم کی ہوئی) حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرنا اور جو لوگ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدوں سے تجاوز کر جاتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

● اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۔(۴)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ آپ پر اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں؛ (لیکن) چاہتے ہیں کہ اپنے

(۱) النساء:۶۵۔

(۲) الاحزاب:۳۶۔

(۳) البقرۃ:۲۲۹۔

(۴) النساء:۶۰۔

مقدمات غیر اللہ کے پاس لے جائیں؛ حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ اس (طاغوت) کے مقابلہ انکار کا رویہ اختیار کریں اور شیطان چاہتا ہی ہے کہ ان کو راہ راست سے خوب دُور ہٹادے۔

● وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ، يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۔ (۱)

اور جولوگ اللہ کی بندگی سے عار کریں گے اور تکبر کریں گے، عنقریب اللہ ان کو اپنے پاس کھینچ لائیں گے، پھر جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا ان کوتو بھر پور اجر دیں گے اور اپنے فضل سے اور زیادہ عطا فرمائیں گے اور جن لوگوں نے اللہ کی بندگی کی باعث ننگ خیال کیا اور تکبر کیا، ان کو دردناک عذاب دیں گے اور وہ اپنے لئے اللہ کے مقابہ کوئی دوست اور مددگار نہ پائیں گے، اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے اور ہم تمہارے طرف کھلی ہوئی روشنی اُتاری ہے، پس جولوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا، اللہ عنقریب ان کو اپنی رحمت وعنایت میں داخل کریں گے اور ان کو درست راستہ کی ہدایت سے نوازیں گے۔

● وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (۲)

---

(۱) النساء:۱۷۲-۱۷۵۔

(۲) آل عمران:۸۵۔

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں بھی نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

● وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۔ (۱)

اور جو اپنے آپ پر ہدایت واضح ہوجانے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کے راستہ کے بجائے دوسرے راستے کے پیروی کرے تو ہم اس کو جو کررہا ہے، کرنے دیں گے اور اس کو دوزخ میں ڈال دیں گے، اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔

جو عزت وبھلائی اور خیر وبرکت کا راستہ چھوڑ کر شر و بے برکتی والا راستہ اختیار کررہا ہے، تو بھلا اس کے لئے بھلائی اور خیر وبرکت کہاں سے آئیں گے، اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں فرمایا :

● اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ، وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ، وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۔ (۲)

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں ایک زبان اور ہونٹ نہیں دیئے اور ہم نے اس کو (خیر وشر کے) دونوں راستے دِکھا دیئے۔

● وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۔ (۳)

اگر ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اختیار نہ کریں اور گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اختیار کرلیں۔

عدالت سے غیر عدت کی دلوائی جانے والی رقم کو قبول کرنے اور اس کے استعمال کا حکم

اگر سرکاری عدالت کی طرف سے فیصلہ ہوجائے کہ سابق شوہر کو تادم حیات یا دوسری شادی ہونے تک مطلقہ کو اخراجات دینے ہیں، تو کیا عدالت سے دلوائی جانے والی ایسی رقم کا قبول کرنا اور اس کا استعمال اس کے لئے جائز وحلال ہوگا؟ شرعی نقطۂ نظر سے اس کا جواب واضح ہے کہ اس کے لئے ایسی رقم کا نہ ہی قبول کرنا درست ہے

(۱) النساء:۱۱۵۔

(۲) البلد:۸-۱۰۔

(۳) الاعراف:۱۴۶۔

اور نہ ہی اس کا استعمال صحیح وحلال ہے؛ کیوں کہ اسلام کی نظر میں یہ مال خبیث ہے؛ اس لئے کہ عدالت کا فیصلہ ہمارے قرآن وحدیث کے یکسر خلاف ہے، جیسا کہ تفصیل سے گذر چکا ہے، نیز اُصولی طور پر نفقہ عدت کے ساتھ مربوط ہے، جب عدت گذر گئی تو نفقہ کا سلسلہ ختم، اس کے بعد اس کو نفقہ نہیں ملے گا، اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ عدت کے بعد شوہر اس پر خرچ نہیں کرے گا، گو وہ اس سے نفقہ کا مطالبہ کرے، (۱) امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''وَ لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'' (۲) کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ حاکم اور دوسرے کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کا مال لے کر دوسرے کو دے۔ (۳)

مال خبیث ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عورت یہ مال ناجائز و باطل طریقہ سے حاصل کر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ناجائز و باطل طریقہ سے مال حاصل کرنے اور کھانے سے منع فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۴)

اور ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ اور نہ (رشوت کے طور پر) حاکموں تک پہنچاؤ؛ تاکہ جانتے بوجھتے لوگوں کا کچھ مال ظلم کے ساتھ کھا جاؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ (۵)

اے ایمان والو! آپس میں ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ، سوائے اس کے کہ آپسی تجارت ہو، (تو کوئی مضائقہ نہیں)۔

وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔ (۶)

اور پاک چیزوں کو حلال کریں اور گندی چیزوں کو حرام کریں گے۔

---

(۱) ہدایہ: ۲/۴۴۰۔

(۲) البقرۃ: ۱۸۸۔

(۳) احکام القرآن للجصاص: ۲/۲۴۱۔

(۴) البقرۃ: ۱۸۸۔

(۵) النساء: ۲۹۔

(۶) الاعراف: ۱۵۷۔

ایک سے زائد مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں کا مال (آپس میں ایک دوسرے پر) تمہارے اوپر حرام ہے، (۱) ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی انسان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر کھانے سے منع فرمایا، (۲) ایک دوسری مرفوع روایت میں ہے: ''کسی انسان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مال ناحق طریقہ سے لے'' راوی کا بیان ہے: یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کا مال دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے۔ (۳)

اس سلسلہ میں اُصول یہی ہے کہ مال کا کھانا اور اس کا استعمال اسی وقت حلال و جائز ہوتا ہے، جب کہ وہ بذاتِ خود حلال ہو، اسی طرح وہ جائز طریقہ سے حاصل کیا گیا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے :

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَـكُمْ بَيْنَـكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا
فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (۴)

اور ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ اور نہ (رشوت کے طور پر) حاکموں تک پہنچاؤ؛ تاکہ جانتے بوجھتے لوگوں کا کچھ مال ظلم کے ساتھ کھاجاؤ۔

زیر بحث مسئلہ میں مطلقہ عورت کا سابق شوہر سے عدت گذرنے کے بعد نفقہ کے لینے کا ذریعہ شرعاً صحیح نہیں ہے، جیسا کہ پوری وضاحت کے ساتھ اوپر بات آچکی ہے۔

جہاں یہ کہنا کہ اگر عدت گذرنے کے بعد سابق شوہر پر نفقہ لازم قرار دیا جائے تو یہ مطلقہ عورت کھانے پینے اور زندگی کی دوسری ضروریات پوری کرنے میں بڑی دشواریوں اور مشکلات سے دوچار ہوگی، یقیناً ایسا ہوسکتا ہے؛ لیکن کوئی ضروری نہیں، اگر ایسی کسی طرح کی دشواریاں آتی ہیں تو اسلام میں مستقل نظام نفقہ موجود ہے، جس کے تحت اس کی ساری دشواریاں اور مشکلات دُور ہوجائیں گی اور وہ نظام نفقہ یہ ہے: مطلقہ اگر خود کفیل ہے تو اس کا نفقہ عدت گذرنے کے بعد خود اس کے ذمہ ہے، اگر وہ خود کفیل نہیں ہے، تو اس کا نفقہ اس کے اولیاء پر لازم ہے، اگر اولیاء استطاعت کے باوجود ادا نہیں کرتے ہیں تو وہ گنہگار رہوں گے اور اگر اولیاء استطاعت نہ رکھتے ہوں تو مطلقہ کے نفقہ کی ذمہ داری خاندان کے لوگوں پر اور سماج پر ہوگی اور جب ایسا کوئی نظم نہ ہو تو علاقائی وقف بورڈ پر اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، نیز معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام کا متوازن ومنصفانہ اور عقل سے قریب اُصول یہ ہے کہ کسی کے

(۱) بخاری، باب الخطبة أيام منى، حديث نمبر: ۱۷۳۹، ترمذی، باب من سورة التوبة، حديث نمبر: ۳۰۸۔

(۲) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۵۴۸۸، دارقطنی، بیوع، حدیث نمبر: ۲۸۸۳، امام زیلعیؒ کا بیان ہے: اس کی سند جید ہے: ۴/۱۶۹، علامہ ابن ملقنؒ کہتے ہیں: ''أخرجه الحاكم في المستدرك في أوائل كتاب العلم عن ابن عباسؓ من طريق جيد'' (البدر المنير: ۶/۶۹۳)۔

(۳) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۶۰۵، صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۵۹۷۸۔ (۴) البقرة: ۱۸۸۔

ضرر ونقصان اور دشواری و پریشانی کو دُور کیا جائے گا؛ لیکن دوسرے کو ضرر ونقصان پہنچا کر اور اس کو دشواری میں ڈال کر نہیں؛ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا ضرر ولا ضرار''(۱) یعنی جس طرح خود انسان ضرر کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا ہے اور نہ ہی برداشت و گوارہ کرنا چاہتا ہے، اسی طرح دوسرے کو بھی ضرر نہیں پہنچانا چاہئے، نہ ہی پہنچانے کا اقدام ابتداءاً کرے اور نہ ہی انتقام کے طور پر فقہاء نے اسی حدیث کے پیش نظر اسلامی اُصول وقانون بیان کیا ہے: ''الضرر لا یزال بالضرر''(۲) یعنی ضرر کو دُور کرنا چاہئے اور دُور کیا جائے؛ لیکن کسی دوسرے کو ضرر پہنچا کر نہیں، اسی بناء پر فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے کا مال بغیر شرعی جواز کے لے۔(۳)

عدالت کے فیصلہ سے ملنے والی رقم کا حکم

اگر کسی مطلقہ مسلمان عورت کے حق میں عدالت کی طرف سے فیصلہ ہوتا ہے کہ عدت کے بعد بھی سابق شوہر پر تادم حیات یا تا نکاح ثانی نفقہ دینا واجب ہے تو کیا عورت کے لئے سابق شوہر کی طرف سے اس ملنے والی رقم کو ہدیہ یا گورنمنٹ کی طرف سے اعانت سمجھ کر عدالت کی مقرر کردہ رقم قبول کرنے کی گنجائش ہوگی؟

پیچھے بات تفصیل سے آچکی ہے کہ یہ مال خبیث ہے، اس کو حاصل کرنے لئے عدالت سے رُجوع ہونا، سابق شوہر سے مطالبہ کرنا، قبول کرنا اور استعمال کرنا سب کچھ شرعاً ناجائز وحرام ہے، اب رہی بات جہاں تک ہندوستان کے حالات کے تناظر میں کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ عورت کے لئے سابق شوہر کی طرف سے اس ملنے والی رقم کو ہدیہ یا گورنمنٹ کی طرف سے اعانت سمجھ کر عدالت کی مقرر کردہ رقم قبول کرنے کی گنجائش ہو؟

دلائل کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم کو گورنمنٹ کی طرف سے مطلقہ مسلم عدت گذرنے کے بعد نفقہ دیتا رہے، یہ دوسرے کے مال میں زبردستی اس کی مرضی کے بغیر تصرف کرنا ہوا اور قرآن وحدیث اور فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں یہ بات گذر چکی ہے کہ دوسرے کا مال بغیر اس کی رضامندی کے لینا ناحق طریقہ پر مال لینا ہے اور ناحق طریقہ پر کسی کا مال لینا جائز اور شریعت اسلامیہ کی نظر میں اس طرح کا مال ناپاک وخبیث متصور ہوتا ہے،

---

(۱) مؤطا امام مالک، الأقضية باب الأقضية في المرافق، حدیث نمبر: ۲۲۶، ابن ماجہ، الاحکام، باب من بنی فی حقہ ما یضر جارہ، حدیث نمبر: ۲۳۴۰، مستدرک حاکم، بیوع: ۲/۵۷، دارقطنی، الأقضية والأحكام: ۴/۲۲۸۔

(۲) الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۱/۸۶، ۸۸۔

(۳) البحر الرائق: ۵/۴۴، الدر المختار ورد المحتار: ۴/۶۱، النہر الفائق: ۳/۱۶۵، الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی: ۴/۳۵۵۔

اگر حکومت مسلم مطلقہ عورتوں کے بارے میں اتنی زیادہ خیر خواہ ہے تو وہ اپنی طرف سے دے اور سچ بات یہ ہے کہ اس کو دینا چاہئے ؛ کیوں کہ مسلم مطلقہ عورت بھی اس کے رعایہ و پبلک میں سے ہے، اور کمزور و پریشان حال رعایا کی مدد کرنا حکومت پر لازم اور اس کی وجوبی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح اس رقم کو شوہر کی طرف سے مطلقہ عورت کے حق میں ہدیہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا؛ کیوں کہ ہدیہ وہبہ درست وصحیح ہونے کے لئے ہدیہ وہبہ کرنے والے مالک مال کی طرف سے رضامندی کا پایا جانا ضروری ہے؛ اس لئے کہ جبر واکراہ کے ساتھ ہدیہ وہبہ درست صحیح نہیں ہوتے ،(۱) اور یہاں تو جبر واکراہ اور زبردستی نفقہ دلایا جاتا ہے، سابق شوہر (مالک مال) کی طرف سے رضامندی نہیں پائی جارہی ہے، نیز معلوم ہونا چاہئے کہ ہبہ، ہدیہ، صدقہ، عطیہ اور گفٹ سب کے سب متقارب المعنی الفاظ ہیں اور زندگی میں بلاعوض تملیک سے عبارت ہیں ، (۲) اس اعتبار سے سب کے سب بیع کے مشابہ ہیں اور بیع زبردستی واکراہ کے ساتھ درست نہیں ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ ہبہ، ہدیہ، صدقہ، عطیہ گفٹ اور بیع درست وصحیح ہونے کے لئے بنیادی طور پر مالک مال کی رضامندی ضروری ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۔ (۳)

اے ایمان والو! آپس میں ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ، سوائے اس کے کہ آپسی رضامندی سے تجارت ہو، (تو کوئی مضائقہ نہیں)۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کسی انسان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر کھانے سے منع فرمایا۔(۴)

اس سلسلہ میں بے سہارا مطلقہ اور خودکفیل مالدار مطلقہ اور اس مطلقہ کے حق میں کوئی فرق نہیں ہوگا، جس کے نفقہ کا انتظام اس کے خاندان کے لوگ کررہے ہوں، فرق نہ کئے جانے کی وجہ حکومت کا سابق شوہر کو مطلقہ بیوی کی عدت گذر جانے کے باوجود اس کو نفقہ دینے پر مجبور کرنا ہے، اگر یہاں حکومت کی طرف سے اکراہ نہ پایا جائے؛ بلکہ سابق شوہر از خود بغیر کسی کے دباؤ واکراہ کے بخوشی اپنی مطلقہ بیوی جس کی عدت گذر چکی ہے، کو پورا یا جزوی طور پر

(۱) مجلۃ الاحکام العدلیۃ، دفعہ:۸۶۰،ص:۱۶۵، مطالب أولی النہی فی شرح غایۃ المنتہی: ۳۹۹/۴۔

(۲) المغنی لابن قدامۃ:۶۴۹/۵۔ (۳) النساء:۲۹۔

(۴) مسند احمد، حدیث نمبر:۱۵۴۸۸، دار قطنی، بیوع، حدیث نمبر: ۲۸۸۳، امام زیلعیؒ کا بیان ہے: اس کی سند جید ہے: ۱۶۹/۴، علامہ ابن ملقنؒ کہتے ہیں: ''أجرجہ الحاکم فی المستدرک فی أوائل کتاب العلم عن ابن عباسؓ من طریق جید'' (البدر المنیر:۶۹۳/۶)۔

نفقہ تادم حیات یا تا نکاح ثانی دیتا ہے، یاعلی الحساب کچھ رقم دیتا ہے یا کوئی بھی شئے دیتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ اس کی طرف سے شرعاً ہدیہ متصور ہوگا اور مطلقہ عورت کے لئے اس کا قبول کرنا بلاکسی کراہت کے درست ہوگا، اس کو قرآن کی زبان میں متعہ بھی کہا جاسکتا ہے، جیسا کہ قرآن نے اس پر اُبھارا بھی ہے اور شوہروں کو اس کی طرف توجہ دلائی اور ترغیب دی: ''اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ''(۱)'' یا بھلے طریقہ پر چھوڑ دو''، ''وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ''(۲)'' اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنا نہ بھولو''۔

عدت کے بعد مطلقہ کیلئے نظام نفقہ

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۔(۳)

اور اپنا خون نہ کرو، بے شک اللہ تمہارے ساتھ بڑے مہربان ہیں۔

وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۔(۴)

اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

معلوم ہوا کہ حفظ جان انسان پر فرض ہے؛ اسی وجہ سے انسان پر بلا عذر کھانا پینا چھوڑ دینا حرام ہے؛ کیوں کہ یہ اس کا عمل اس کو ہلاکت سے دوچار کرے گا اور بالآخر وہ خودکشی کا مرتکب ہوگا،(۵) اللہ تعالیٰ نے انسان پر جان کی حفاظت کے مقصد کے لئے واجب قرار دیا ہے کہ اگر وہ کسبِ معاش پر قدرت رکھتا ہے تو اس پر کسبِ معاش واجب ہے، اگر اس کی قدرت نہ ہو اور اس کے پاس مال ہو تو اس کا نفقہ خود اس پر اس کے مال میں واجب ہے اور اگر اس کے پاس مال بھی نہ ہو تو اس کا نفقہ اس کے والد اور دیگر رشتہ داروں پر اس تفصیل کے مطابق واجب ہوگا، جیسا کہ کتب فقہ اسلامی میں لکھا ہے۔

جہاں تک عورت کی بات ہے تو اُصولی طور پر اس کا نفقہ مرحلہ وار دوسروں پر لازم ہوتا ہے، خود اس کی ذات پر لازم نہیں ہوتا ہے، خواہ وہ کم سن ہو یا بڑی ہو، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، مطلقہ ہو یا غیر مطلقہ؛ کیوں کہ

---

(۱) البقرۃ:۲۳۱۔

(۲) البقرۃ:۲۳۷۔

(۳) النساء:۲۹۔

(۴) البقرۃ:۱۹۵۔

(۵) مفاتیح الغیب:۵/۲۰۲۔

اس کا عورت ہونا ہی کمانے سے عاجز وقاصر ہونا ہے، (۱) اس لئے اس کو کسبِ معاش کا مکلف نہیں بنایا گیا؛ البتہ اس اصل سے بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں، جن میں عورت کا نفقہ خود اس کی ذات پر لازم ہوتا ہے، اس اصل و بنیاد پر مطلقہ عورت کے نفقہ کی چند صورتیں نکل کر سامنے آتی ہیں :

۱- اگر عورت بذات خود مالدار ہو، یا اس کے پاس اتنا مال ہو کہ اس کی ضروریات کے لئے کافی ہوں، تو اس کا نفقہ اس کے باپ اور نہ ہی دوسرے رشتہ داروں پر واجب ہوگا ؛ بلکہ اس کا نفقہ خود اس کی ذات پر اس کی دنیاوی ضروریات کے لئے واجب ہوگا ، اسی طرح اگر عملی طور پر کما رہی ہو اور اتنی کمائی ہو جاتی ہو کہ اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو جاتی ہو تو اس کا نفقہ اسی پر لازم ہوگا ، جیسے: نرس ہے، یا ڈاکٹر ہے، یا درزی ہے، یا کسی بھی جائز پیشہ سے مربوط ہے اور وہ کماتی ہے، واضح رہے کہ ایسی صورت میں اس کی تمام تر بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں، تو دوسروں پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا اور اگر تمام تر بنیادی ضروریات پوری نہ ہو پاتی ہوں تو باقی ماندہ اخراجات پورے کرنے کے لئے اس کا نفقہ باپ پر اگر وہ زندہ ہیں، ورنہ دوسرے رشتہ داروں پر اسی تفصیل کے مطابق واجب ہوگا، جیسا کہ کتب فقہ اسلامی میں مذکور ہے۔ (۲)

اس پر دلیل قرآن کریم کی وہ وضاحت ہے جو یتیموں اور سفہاء کے مالوں کی بابت آئی ہے، جس میں ہے کہ ان لوگوں پر ان کے مالوں سے خرچ کیا جائے گا اور اگر خرچ کرنے والا نگراں ضرورت مند ہے تو وہ اپنی نگہداشت کے بدلہ بھلا طریقہ پر مروج اُجرت لے کر اپنے اوپر خرچ کر سکتا ہے۔ (۳)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ، وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۔ (۴)

(۱) الدر المختار مع الرد، باب النفقۃ: ۵/ ۳۴۱۔

(۲) رد المحتار: ۳/ ۲۸۶، ۳۳۶، ۳۳۷، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ للجزیری: ۴/ ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، الموسوعۃ الفقہیۃ کویت: ۸/ ۲۱۵، بحوالہ فتح القدیر: ۳/ ۳۴۳، کشاف القناع: ۵/ ۴۸۱، المحلی علی المنہاج: ۴/ ۸۴، الخرشی علی مختصر خلیل: ۴/ ۲۰۴، ۲۰۵۔

(۳) السیل الجرار علی حدائق الأزہار للشوکانی: ۴۶۵۔ (۴) النساء: ۵-۶۔

اور ناسمجھوں کو اپنے مال حوالہ نہ کرو، جس کو اللہ نے تمہارے لئے گذر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے، ہاں! ان کو اس مال میں سے کھلاتے، پہناتے رہو اور ان سے بھلی بات کرتے رہو اور یتیموں کو آزماتے رہو؛ یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پھر تم ان میں ہوشمندی دیکھو تو ان کو ان کے مال حوالہ کر دو اور اس کو اس خوف سے فضول خرچی کر کے جلدی جلدی نہ کھاؤ کہ یہ بڑے ہو جائیں گے اور جو ضرورت مند نہ ہو، اسے تو بچنا ہی چاہئے، ہاں! جو محتاج ہو وہ مناسب طریقہ پر کھا سکتا ہے، پھر جب تم ان کو ان کا مال حوالہ کر تو گواہ بھی بنالو اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہیں۔

اس آیت سے استدلال یوں ہے کہ انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جب اس کے پاس مال ہو تو اس کا نفقہ دوسروں پر واجب قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس یتیم کا نفقہ اس کے اولیاء پر واجب قرار نہیں دیا، جس کے پاس خود اس کے مال اتنے ہیں جو اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہیں۔

۲- اگر مطلقہ عورت کا نومولود بچہ سابق شوہر سے ہے تو شرعاً وہی دُودھ پلانے اور اس کی پرورش ونگہداشت اور حضانت کی زیادہ حقدار ہے، جس کی اُجرت وہ بچہ کے والد سے وصول کر سکتی ہے، اس کے ضمن میں وہ بچہ کے کھانے پینے سے لے کر تعلیمی فیس وغیرہ تک تمام تر اخراجات بچہ کے والد سے لے گی؛ کیوں کہ وہ اس کی منکوحہ نہیں ہے اور نہ ہی بچہ کے باپ کی معتدہ ہے، (۱) واضح رہے کہ بچہ کو دُودھ پلانے اور دیگر نفقہ یعنی اخراجات عرف کے مطابق معروف وبھلا طریقہ پر مقرر ہوگا، اس میں بچہ کا باپ سابق شوہر کی حالت کی رعایت رکھی جائے گی؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ'' (۲) ''وسعت والے کو چاہئے کہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرے''۔

۳- اگر مطلقہ عورت محتاج وتنگدست ہو، سابق شوہر سے نومولود بچہ بھی نہ ہو کہ اس کی پرورش وحضانت اور رضاعت کے ذریعہ اپنی گذر اوقات کا نظم کر سکتی تھی اور نہ ہی کوئی اور ذریعہ معاش وپیشہ اس کے پاس ہے، جس سے اپنی روزی روٹی کا نظم کر سکتی تھی، ایسی صورت میں اگر اس کی مالدار بیٹی اور غنی بیٹا دونوں ہیں، یا ان میں سے کوئی ایک ہے تو ان پر اس کا نفقہ واجب ہوگا؛ (۳) کیوں کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم بڑا ہی مؤکد بلکہ اولاد پر

(۱) البحر الرائق: ۴/ ۲۲۱، الہندیہ: ۱/ ۵۴۳، رد المحتار: ۵/ ۲۷۶۔

(۲) الطلاق: ۷۔

(۳) دیکھئے: الاقناع لابن المنذر: ۱/ ۳۱۳، شرح مختصر الطحاوی للجصاص: ۵/ ۳۱۳، رد المحتار: ۳/ ۶۲۳۔

واجب ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا'' (۱) ''اور والدین کے ساتھ بہتر سلوک کرو''، ''وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا'' (۲) ''اور بہتر طور پر دنیا میں ان کے ساتھ رہو'' حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے لئے سب سے بہتر و پاکیزہ کھانا اس کی اپنی کمائی ہے اور اس کی اولاد اس کی کمائی ہے۔ (۳)

۴- اگر مطلقہ عورت سے کوئی اولاد ہی نہ ہو اور اگر ہو بھی تو خود ہی تنگدست ہو اور خود مطلقہ عورت کے پاس مال نہ ہو اور اگر ہو بھی تو اس کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو تو جمہور فقہاء جن میں احناف بھی شامل ہیں کے نزدیک اس کا نفقہ پہلی صورت میں کلی طور پر اور دوسری صورت میں جزوی طور پر اس کے باپ پر واجب ہوگا؛ بشرطیکہ اس کا باپ بقید حیات ہو اور باپ کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ اس کو کام کرنے پر مجبور کرے، گو وہ کام کرنے پر قادر ہو، (۴) دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضرت ہند بنت عتبہؓ نے کہا: یا رسول اللہ! ابوسفیانؓ ایک بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے اتنا مال بھی نہیں دیتے ہیں، جو میرے اور میرے بچوں کے لئے کفایت کر جائے، بجز اس کے کہ میں خود ان کے مال سے مزید کچھ اور لے لوں اور ان کو اس کا علم نہ ہو، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم بھلے طریقہ پر اتنا مال لو جو تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے کفایت کر جائے''۔ (۵)

۵- اگر مطلقہ عورت کے والد بھی زندہ نہ ہوں، تو اس کا نفقہ اس کے دوسرے رشتہ داروں پر واجب ہوگا، دوسرے رشتہ داروں پر نفقہ کے وجوب کے بارے میں جزئیت اور قرابت کا اعتبار ہوگا، جزئیت پائے جانے کے بعد قرابت کے اعتبار سے جو زیادہ قریب اور مالدار ہوگا اس پر پہلے نفقہ واجب ہوگا، اگر وہ مالدار نہیں ہے تو اس کے بعد قریب مالدار رشتہ دار پر واجب ہوگا، اسی طرح آگے وجوب منتقل ہوتا جائے گا، اگر قرابت داروں میں کوئی نہ ہو، تو اس کے ذوی الارحام رشتہ داروں پر نفقہ واجب ہوگا، بشرطیکہ ذوی الارحام رشتہ داروں میں سب سے قریب محرم رشتہ دار ہو، مالدار ہو اور مطلقہ عورت تنگدست و محتاج ہو اور اس کے لئے کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور نہ کوئی پیشہ ہو جس کو اختیار کر کے کچھ کما سکے۔ (۶)

---

(۱) البقرۃ: ۸۳، انعام: ۱۵۱، بنی اسرائیل: ۲۳۔ (۲) لقمان: ۱۵۔

(۳) نسائی، بیوع، باب الحث علی الکسب، حدیث نمبر: ۴۴۵۲، ابن ماجہ، تجارات، حدیث نمبر: ۲۱۳۷، صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۴۲۶۰۔

(۴) اختلاف الأئمۃ لابن ہیرۃ: ۲/ ۲۱۲، فتح القدیر: ۴/ ۳۱۷، منح الجلیل شرح مختصر الخلیل، فصل فی نفقۃ الرقیق والدابۃ: ۴/ ۴۱۸، الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۸۲۴، الفقہ علی المذاہب الأربعۃ: ۴/ ۵۱۲۔

(۵) بخاری، نفقات، باب إذا لم ینفق الرجل، حدیث نمبر: ۵۳۶۴، مسلم، حدود، حدیث نمبر: ۷-۱۷۱۴۔

(۶) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: ۴/ ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷۔

۶- اگر مطلقہ عورت کے لئے کوئی ذوی الارحام اور دوسرے اقربہ میں سے کوئی نہ ہو اور وہ خود مالدار بھی نہ ہو اور نہ ہی اس کے پاس اتنا مال ہو کہ اس سے اپنی ضروریات پوری کرسکے، تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ بیت المال پر واجب ہوگا، اگر مسلمانوں کا بیت المال نہ ہو تو اس کا نفقہ اس کے علاقہ میں موجود رفاہی مسلم تنظیم اور سماج پر واجب ہوگا اور جب ایسا کوئی نظم نہ ہو تو علاقائی وقف بورڈ پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی، اور اگر علاقائی وقف بورڈ نہ ہو اور اگر ہو لیکن اس کے لئے وہاں سے نفقہ حاصل کرنا مشکل ہو، تو اگر وہ کمانے پر قادر رہے تو شرعی حدود میں رہتے ہوئے کما کر کھائے گی اور زندگی بسر کرے گی اور کمانے کی قدرت نہ ہو اور اس کے لئے کوئی اور ذریعہ معاش نہ ہو تو ایسے وقت میں اس کے لئے دست سوال پھیلانا جائز ہے؛ کیوں کہ یہاں پر وہ مضطر کے حکم میں ہے؛ لہٰذا بقدر ضرورت بھیک مانگ سکتی ہے؛ کیوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت قبیصہؓ سے فرمایا: ''دست سوال پھیلانا تین طرح آدمیوں کے علاوہ کسی اور کے لئے جائز نہیں، ان تین میں ایک وہ شخص ہے جو فاقہ میں مبتلا ہو''۔(۱)

مطلقہ کے نکاح ثانی کے اخراجات کا مسئلہ

نکاح سے حاصل ہونے والے دینی و دنیاوی بلند مقاصد و مصالح سے کسی کو انکار نہیں، ان عالی مقاصد ومصالح سے وہی شخص مستفید ہوسکتا ہے جو شادی کرے، جو اس کوچہ میں قدم ہی نہ رکھے تو اس کو نکاح کے خیر وبرکات، مصالح ومفاد اور اہداف ومقاصد کا صحیح معنوں میں کچھ اندازہ نہیں ہوسکتا۔

دنیاوی اعتبار سے نکاح معیشت کی جڑ واساس ہے؛ اس لئے کہ گھر کے دو بڑے اہم ستون مرد وعورت ہیں، جن سے ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے اور ایک نئے گھر کا وجود منصۂ شہود پر آتا ہے اور وہ اس طرح کہ عورت اندرون گھر سنبھالتی ہے، گھر کا کام کرتی ہے، گھر کی نگہداشت کرتی ہے، شوہر کے خزانہ وعصمت کی حفاظت کرتی ہے، اولاد کی تربیت کرتی ہے اور دیگر اُمور خانہ داری پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتی ہے، جہاں تک مرد کی بات ہے تو وہ گھر سے باہر تمام کام کو انجام دیتا ہے، عورت کے نفقہ کا انتظام کرتا ہے اور اس کی عصمت وناموس کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

دینی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے بہت سارے فوائد ومقاصد نکل کے سامنے آتے ہیں: عفت نفس، اُمت محمدیہ کی تکثیر، کثرت اُمت سے جہاں رسول ﷺ کے لئے قیامت کے روز باعث افتخار ہوگی، وہیں سیاسی

(۱) دیکھئے: مسلم، باب من تحل لہ المسئلۃ، حدیث نمبر: ۱۰۹-۱۰۴۴۔

اعتبار سے مجموعی طور پر اُمت کو تقویت ملے گی اور دوسرے لوگ کثرت کو دیکھ کر مرعوب ہوں گے، نکاح گھر سے باہر پست نگاہی اور شرمگاہ کی حفاظت میں اور شیطانیت کے فتنہ سے دوری میں معین و مددگار ثابت ہوتا ہے، قلبی فرحت وسکون، اور دماغی راحت حاصل ہوتے ہیں، شادی سے انبیاء ورسل کی سنت پر عمل، اللہ اور اس کے آخری رسول محمد ﷺ کے حکم پر عمل سے بڑا اجر وثواب ملتا ہے، اسی طرح نکاح کے بندھن سے بندھنے کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی اور اولاد کی تعلیم وتربیت سے بڑے اجر وثواب مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح نکاح سے خوشحالی آتی ہے اور رزق میں برکت ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۔(۱)

اور اپنے میں سے غیر شادی شدہ (خواہ شادی ہی نہ کی ہو، یا کسی اور سبب سے بیوی یا شوہر نہ ہو)، نیز اپنے غلاموں اور باندیوں میں سے جو نکاح کے لائق ہوں، ان کا نکاح کر دو، اگر وہ تنگ دست ہیں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو مالدار کر دیں گے اور اللہ وسعت والے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔

ظاہر ہے اتنے سارے فوائد کے پیش نظر مطلقہ عورت کا نکاح ثانی ہونا چاہئے؛ تا کہ وہ بھی نکاح کی سعادت سے سرفراز ہو کر ان فوائد سے لطف اندوز ہو، جیسا کہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ جو اپنے لئے پسند کریں وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کریں اور نیز معقول بات نہیں ہے کہ وہ غمزدہ، مایوس، ذہنی تناؤ انتشار اور پریشان حال بیچارگی کی زندگی گذارے، کوئی اس کا غمگسار نہ ہو، کوئی اس کا پُرسان حال نہ ہو، کوئی اس کا رازدار نہ ہو، کوئی اس کا دل لگانے والا نہ ہو اور نہ اس کے پاس سامان فرحت وسکون ہو۔

پس معلوم ہوا کہ دین ودنیا، عقل ونقل اور خاص طور پر اس پُرفتن دور میں نکاح مطلقہ عورت کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک نکاح ثانی کے اخراجات کی بات ہے تو اگر خود کفیل اور مالدار ہے تو اس کے نکاح کے سارے اخراجات خود اس کے ذمہ ہوں گے، یا اگر اس کے پاس اتنا مال ہے کہ اس سے اس کے نکاح کے سارے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے ہیں تو باقی ماندہ اور اگر تنگدست ہے تو پورے اخراجات اس کے موجود مالدار اولاد بیٹے اور بیٹیوں پر اور اگر ان میں سے ایک موجود مالدار ہے تو صرف اس پر واجب ہوں گے؛ کیوں کہ ماں کے ساتھ

(۱) النور: ۳۲۔

حسن سلوک کرنا زیادہ مؤکد ہے، جیسا کہ پیچھے قرآن وحدیث کے حوالہ سے مفصل دلیلیں گذر چکی ہیں، نیز ماں باپ کو عفیف النفس باقی رکھنا اولاد پر واجب ہے،(۱) اور اگر کوئی اولاد نہ ہو، یا ہو لیکن تنگدست ہو، تو اس کے باپ اس کے بعد اس کے دوسرے اولیاء پر اس کے نکاح کے اخراجات کی ذمہ داری ہوگی اور اولیاء کو اس کے نکاح کی فکر کرنی چاہئے، اگر اولیاء استطاعت کے باوجود اس کے نکاح کے اخراجات برداشت نہیں کرتے ہیں تو وہ گنہگار ہوں گے اور اگر اولیاء استطاعت نہ رکھتے ہوں تو مطلقہ کے نکاح کی ذمہ داری خاندان کے لوگوں پر اور سماج پر ہوگی اور جب ایسا کوئی نظم نہ ہو تو علاقائی وقف بورڈ پر اس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

اسبابِ طلاق اور طلاق دینے کا حکم

بات تفصیل سے آچکی ہے کہ طلاق اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ایک ناپسندیدہ شئے ہے، اسلام کسی بھی درجہ میں طلاق دینے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا ہے؛ بلکہ ہمیشہ ہمہ وقت بھلے طریقہ پر ازدواجی زندگی گذارنے کی ترغیب دیتا ہے، یہاں تک عورت بدچلن، بدزبان اور بددین کیوں نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔ (۲)

اور ان کے ساتھ اچھی طرح گذر بسر کرو، اگر وہ تم کو نہیں بھاتی ہیں تو ہوسکتا ہے کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ نے اسی میں بہت سی خوبیاں رکھی ہیں۔

اسی طرح اگر طلاق دینے کے جائز اسباب موجود ہوں، اس کے باوجود شرعاً طلاق دینا شوہر پر واجب نہیں ہے؛ بلکہ عام طور پر مستحب وپسندیدہ بھی نہیں ہے، ایسے وقت میں بھی اسلام چاہتا ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق نہ دے، اس کے ساتھ خوش اُسلوبی کے کے ساتھ زندگی بسر کرے؛ لہٰذا جائز اسباب طلاق پائے جانے کے باوجود کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیتا ہے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا اور کل قیامت کے روز اس کی پکڑ نہیں ہوگی، ہاں! بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں طلاق دینا شوہر پر واجب ہوتا ہے، جیسے مرد عنین ہو، یا خصی شدہ ہو وغیرہ؛ کیوں کہ امساک بالمعروف یعنی بھلے طریقہ پر روک رکھنا اور اس کے ساتھ خوش اُسلوبی اور حسن معاشرت کے ساتھ گذر بسر کرنا فوت ہوجا رہا ہے،(۳) جس کا اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم دیا ہے۔

---

(۱) شرح السنۃ للبغوی: ۹/ ۳۳۰۔

(۲) النساء: ۱۹۔

(۳) ردالمحتار: ۳/ ۲۲۹۔

جہاں تک شرعی نقطۂ نظر سے طلاق کے مباح اسباب کی بات ہے تو یہ کئی ہیں اور وہ یہ ہیں :

۱- عورت شوہر کی امانت میں خیانت کرے اور وہ یہ ہے کہ عورت اجنبی مرد سے غیر شرعی تعلق قائم کرے، دوسرے الفاظ میں عورت بدچلن و فاحشہ ہو، ابن سیرینؒ اور ابوقلابہؒ تابعی کا بیان ہے: خلع جائز نہیں ہے، ہاں! جب کہ عورت کے پیٹ پر اجنبی مرد پایا جائے ؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ''اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ''(۱) ''سوائے اس کے کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کریں'' فقہاء نے لکھا ہے: شوہر پر بدکار بیوی کو طلاق دینا واجب نہیں ہے اور نہ ہی اس پر لازم ہے کہ اس کو چھوڑ دے، ہاں! جب کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اس وقت دونوں کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ بلکہ ایسے وقت میں علاحدگی مستحب ہے۔(۲)

۲- بدزبان ہو، جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ حصرت عبداللہ بن عمرؓ کی اہلیہ محترمہؓ زبان کی تیز تھیں ؛ اسی وجہ سے انھوں نے اس کو طلاق دے دی، (۳) ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ اپنے سسرال والوں پر زبان دراز تھیں، اس وجہ سے ان کے شوہر نے ان کو طلاق دے دی، (۴) فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر عورت بدزبان ہو تو اس کے شوہر کے لئے اس کو طلاق دینا جائز ہے واجب نہیں، اور اگر شوہر کو ایذا پہنچاتی ہو تو اس کو طلاق دینا مستحب ہے، خواہ اس کی ایذا رسانی زبان سے ہو یا عمل سے، (۵) بہر حال معلوم ہوا کہ اگر عورت بدزبان ہو تو اس کو طلاق دینا جائز ہے واجب نہیں۔

۳- دین دار نہ ہو، یہاں تک کہ وہ فرض نمازیں تک نہ پڑھتی ہو، شراب نوشی اور دوسرے منشیات کی عادی ہو چکی ہو، یا دوسرے فسق کے کام کرتی ہو، ایسی صورت اس عورت کے شوہر پر لازم ہے کہ وہ اس کو سمجھائے، نصیحت کرے، بھلی بات کا حکم دے اور بُری باتوں اور عادتوں سے روکے، اگر سمجھانے سے نہ سدھر سکے تو جائز حدود میں رہتے ہوئے اس کی پٹائی کرے، اس کے باوجود وہ سدھر نہ سکے، تب بھی شوہر پر طلاق دینا واجب نہیں؛ کیوں کہ شوہر نے اپنی ذمہ داری ادا کی، عورت کا گناہ اس کے سر، وہ اپنے گناہ کے بارے میں جواب دہ ہوگی اور اس کا خمیازہ بھگتے گی، یہی اسلامی اُصول اور اس کا تقاضا ہے، (۶) جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے :

---

(۱) النساء:۱۹۔

(۲) البحر الرائق: ۳/ ۱۱۵، الدر المختار ورد المحتار: ۳/ ۲۲۹۔

(۳) نیل الأوطار للشوکانی: ۶/ ۲۶۲۔

(۴) ترمذی، باب فی المطلقۃ ثلاثاً، حدیث نمبر: ۱۱۸۰، بدائع الصنائع: ۳/ ۲۱۰۔

(۵) الدر المختار ورد المحتار: ۳/ ۲۲۹۔

(۶) الدر المختار ورد المحتار: ۳/ ۲۲۹۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ - (۱)
اگر تم کو اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر عورت اپنی رہائی کے لئے کچھ دیدے تو زوجین پر (اس طرح معاملہ طے کرنے میں) کچھ مضائقہ نہیں۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ کا بیان ہے: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بے نمازی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنا جائز ہے، اس میں مرد پر کوئی گناہ نہیں؛ بلکہ خود اس کا گناہ اس پر ہوگا، اسی وجہ سے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ نماز چھوڑنے پر مرد کے لئے اس کو مارنا جائز ہے۔(۲)

۴- ایسے عیب کا پایا جانا جو مقاصد نکاح کو بروئے کار لانے میں مانع ہو، جیسے: دونوں میں سے کسی میں ایسا مرض ہو یا کوئی قابل نفرت شئے ہو، یا عورت کی شرمگاہ میں ہڈی نکل گئی ہو، جس کی وجہ سے جماع ممکن نہ ہو اور حاذق طبیب نے رپورٹ دی کہ یہ لاعلاج عیب ہے، یہاں تک آپریشن کے ذریعہ بھی اس کا ازالہ ممکن نہیں، ایسے وقت میں مرد کے لئے ایسی بیوی کو طلاق دے کر الگ کردینے کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ زوجیت کی بنیاد استمتاع پر ہے اور یہاں استمتاع ممکن نہیں، نیز غور وفکر کا مقام ہے کہ زنا سے حفاظت، ذہنی وقلبی سکون اور اولاد جماع سے حاصل ہوتے ہیں، شرمگاہ میں موجود ہڈی وغیرہ مرض اور عیب وطی سے مانع ہیں، (۳) نیز یہاں عقل ونقل دونوں اعتبار سے علاحدگی اختیار کرنا لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۵- اسی طرح اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف عروج پر ہو، نفرت دونوں کے درمیان اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنا نہ چاہتے ہوں، خواہ اس کے وجہ دونوں کے درمیان طبعی و ذہنی مناسبت وتوافق کا نہ ہونا ہو، یا کوئی اور جوہ ہو، اختلاف کو پاٹنے کے لئے تمام تر تدبیریں اور کوششیں ناکام ہو چکی ہوں، قرآن کی رو سے دونوں خاندان کے اہل خرد حکم کی حیثیت سے دونوں کے درمیان اتحاد واتفاق پیدا کرنے سے عاجز آچکے ہوں، زوجین کے درمیان اللہ کی قائم کردہ حدیں باقی رہنا مشکل ہو چکی ہو، غرضیکہ اب دونوں کے درمیان سوائے طلاق وتفریق کے کوئی اور چارہ نظر نہیں آرہا ہے، شادی ہوتی اس لئے ہے کہ دونوں کے درمیان مودت واُلفت اور پیار ومحبت کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر ہو، یہاں یہ مقصد حاصل ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا ہے، تو گھر جنت کا

---

(۱) البقرۃ:۲۲۹۔
(۲) البحر الرائق:۳/۴۱۴۔
(۳) موسوعۃ فقہیہ کویت:۹۶/۲۲۔

نمونہ بننے کے بجائے جہنم کا نمونہ بنا رہے، اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ دونوں ایک دوسرے الگ ہوجائیں اور اپنا اپنا نیا گھر بسائیں اور خوش وخرم زندگی بسر کریں۔(۱)

۶- عورت بانجھ ہو، تو شرعاً اس کی بات کی گنجائش ہے کہ مرد اس کو طلاق دے کر دوسری شادی کرلے؛ کیوں کہ بانجھ پن میں افزائش نسل نہیں ہوسکے گی، جو کہ نکاح کی مشروعیت کے اہم مقاصد میں سے ہے، نبی کریم ﷺ نے کثرت سے جننے والی عورت سے شادی کی ترغیب فرمائی ہے، ظاہر ہے کہ اس سے آنحضرت ﷺ کا مقصد پورا ہوگا کہ کل قیامت کے روز آپ ﷺ کی اُمت کے اضافہ میں معاون ثابت ہوگا اور آپ ﷺ کثرت تعداد پر فخر فرمائیں گے، (۲) اسی وجہ سے اسلام نے ہر ایسے عمل سے روکا ہے جو افزائش نسل کے لئے مانع ثابت ہو، جیسے بیوی سے مباشرت کرتے وقت عزل سے روکا ہے، (۳) بیوی کے پیچھے کے راستہ میں جماع سے منع کیا ہے، (۴) اور واضح الفاظ میں تاکید کے ساتھ بانجھ عورت سے شادی کرنے سے روکا ہے۔(۵)

● ● ●

---

(۱) البحر الرائق: ۳/ ۲۵۳، الدر المختار ورد المحتار: ۳/ ۲۲۸۔

(۲) ابوداؤد، باب النہی عن تزویج من لم یلد، حدیث نمبر: ۲۰۵۰، نسائی، کراھیۃ تزویج العقیم، حدیث نمبر: ۳۲۲۷، صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۴۰۲۸، مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۲۶۸۵، حاکم کا بیان ہے: ''هذا حديث الاسناد، ولم يخرجاه بهذا السياقة'' حافظ ذہبیؒ نے حاکم کی موافقت کی۔

(۳) ترمذی، نکاح، باب فی العزل، حدیث نمبر: ۱۱۴۷۔

(۴) بخاری، باب غزوۃ بنی مصطلق، حدیث نمبر: ۴۱۳۸۔

(۵) مستدرک حاکم: ۳/ ۲۹۰، ط: دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، حافظ ابن حجر کا بیان ہے: ''اس حدیث کی سند ضعیف ہے'' (التلخيص الحبير: ۳/ ۱۱۶، ط: شركة الطباعة الفنية)۔

حرمت مصاہرت

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی ☆

کتاب وسنت میں ان لوگوں کے بارے میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے، جن سے نکاح کرنا حرام ہے، جس میں سے ایک سسرالی رشتہ بھی ہے اور واقعیت پسندی کا تقاضا ہے کہ مرد وعورت کی قربت چاہے باضابطہ ہوئی ہو یا بے ضابطہ، دونوں حالتوں میں قریب ترین رشتے ایک دوسرے کے لئے حرام ہوجائیں؛ تاکہ ان کے درمیان بے لباس ہونے کی نوبت نہ آئے۔

فکر ونظر کو وسعت دینے پر یہ حقیقت بھری دوپہر کی طرح عیاں ہوجائیگی کہ نسب، رضاعت اور صہریت کی وجہ سے جن رشتوں کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے ان میں بنیادی سبب ''جزئیت'' ہے، یعنی اس تعلق کی وجہ سے مرد وعورت ایک دوسرے کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں، اس لئے ایک دوسرے کے رشتہ داران کے اپنے رشتہ دار کی طرح ہوجاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ جزئیت جس طرح سے جائز تعلق سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح سے ناجائز تعلق سے بھی ثابت ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ۔ (۱)

وہ ذات جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سسرالی رشتوں والا کردیا، بلاشبہ تیرا پروردگار ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت میں شادی کے ذریعہ وجود میں آنے والے رشتہ کے لئے ''صہر'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس سے ''مصاہرت'' کا لفظ بنایا گیا ہے، جس کے معنی قریب کرنے یا پگھلانے کے ہیں، یعنی اس کی وجہ سے دو مختلف خاندان ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں، اور ایک دوسرے کا حصہ اور جزو بن جاتے ہیں، اور مرد وعورت ایک دوسرے میں ضم ہوکر اور ڈھل کر ایک نئے خاندان کو جنم دیتے ہیں، عورت کے والدین مرد کے والدین کی طرح

☆ استاذ: جامعۃ الفلاح بلیریا گنج، اعظم گڑھ۔

(۱) الفرقان: ۵۴۔

ہوجاتے ہیں اور مرد کے والدین عورت کے لئے اس کے والدین کی طرح ہوجاتے ہیں اور ان دونوں کی اولاد حقیقی اولاد کی طرح ہوجاتی ہے، اسی حقیقت کو اہل لغت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

والصهر ما كان من خلطة تشبه القرابة يحدثها التزوج ۔ (۱)

حرمت مصاہرت کے ثبوت کے مختلف طریقے

قرب تعلق کے احترام وعظمت کی وجہ سے رشتہ نکاح کے حرام ہونے کے مختلف طریقے اور متعدد صورتیں ہیں، جن میں سے بیشتر کے بارے میں فقہاء کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے اور بعض کے متعلق قدرے اختلاف ہے، جس کی تفصیل یہ ہے :

۱-نکاح صحیح، جائز تعلق یا مقدمات جماع

کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کرلیا تو محض عقد کی وجہ سے اس کے بیٹے کے لئے وہ عورت حرام ہوجائیگی، اس لئے یکجائی کی نوبت آنے سے پہلے ہی اسے طلاق دیدے یا وفات پاجائے تو اس کے بیٹے کے لئے اس سے نکاح کرنا حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا وَ سَآءَ سَبِيْلًا ۔ (النساء:۲۲)

اوران عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہے، مگر جو گذر چکا ہے، یہ بے حیائی کا کام ہے اور نفرت کا سبب ہے اور نہایت بُرا طریقہ ہے۔

اور حضرت براء بن عازب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ میرے ماموں جھنڈا اُٹھائے چلے آرہے ہیں، میں نے دریافت کیا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ کہا :

بعثني رسول الله صلى الله الى رجل تزوج امرأة ابيه من بعده ان اضرب عنقه و آخذ ماله ۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی بیوی اور اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کرلیا ہے، آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس کا سر دھڑ سے الگ کردوں اور اس کے مال واسباب کو ضبط کرلوں۔

(۱) لسان العرب: ۴/ ۴۷۳، تاج العروس: ۳۴۵۔

(۲) ابوداؤد: ۴۴۵۵، ترمذی: ۱۳۶۲، نسائی: ۳۳۳۱۔

اس واقعہ سے اس رشتے کے تقدس وعظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سوتیلی ماں سے محض نکاح کی وجہ سے روئے زمین پر اس کے وجود کو گوارا نہیں کیا گیا اور توبہ ومعافی کا موقع دیئے بغیر اس کا سرتن سے جدا کر دیا گیا اور اس کے مال وجائیداد کو ضبط کرلیا گیا، اسی طرح سے کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کرلیا ہے تو اس کی منکوحہ اس کے باپ کے لئے حرام ہوجائے گی اور خلوت وصحبت سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دے یا اس کی وفات ہوجائے تو اس کے باپ کے لئے اس کا نکاح کرنا حلال نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۔ (النساء:۲۳)

اور تمہارے سگے بیٹوں کی بیویاں تمہارے لئے حرام ہیں۔

تمام فقہاء کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ بہو اور سوتیلی ماں محض عقد کی وجہ سے حرام ہوجاتی ہے،(۱) اسی طرح سے اس پر بھی تقریباً اتفاق ہے کہ ساس بھی محض نکاح کی وجہ سے حرام ہوجاتی ہے، خواہ اس کی بیٹی سے یکجائی کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو؛(۲) کیوں کہ قرآن میں ہے کہ: ''وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ ''(النساء:۲۳)'' اور تمہاری عورتوں کی مائیں بھی تمہارے لئے حرام ہیں''۔

اس آیت میں کسی تفصیل اور شرط کے بغیر ساس کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس لئے اس کی عمومیت کا تقاضا ہے کہ کسی عورت سے نکاح کے بعد اس کی ماں سے نکاح کرنا حرام ہو، خواہ نکاح کے بعد خلوت کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے یہی تفسیر منقول ہے اور یہی صحیح ہے اور اس کے برخلاف رائے کسی صحابی سے ثابت نہیں ہے،(۳) اور ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت عمرو بن شعیبؓ کی سند سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

اذا نكح الرجل المرءة فلا يحل له ان يتزوج امها دخل البنت او لم يدخل ۔ (۴)

جب کوئی کسی عورت سے نکاح کرے تو اس کے لئے اس کی ماں سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے، چاہے اس نے اس کے ساتھ صحبت کی ہو یا نہ کی ہو۔

(۱) اتفق المسلمون على تحريم الاثنين بنفس العقد وهو تحريم زوجات الآباء والابناء، بداية المجتهد : ۲/ ۳۳۔

(۲) فان جمهور السلف ذهبوا الى ان الام تحرم بالعقد على الابنته والأم تحرم الابنة الا بالدخول بالأم وبهذا قول جميع ائمة الفتوىٰ الامصار الجامع لاحكام القرآن للقرطبی :۶/ ۱۷۴۔

(۳) دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن للقرطبی :۶/ ۱۷۵۔

(۴) تفسیر طبری :۸/ ۱۴۶۔

اوراس پربھی تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی عورت سے محض نکاح کرلینے سےاس کی بیٹی سے نکاح کرنا حرام نہیں ہوگا؛ بلکہ اس کی حرمت کے لئے صحبت وخلوت شرط ہے؛ کیوں کہ قرآن حکیم میں ہے :

وَ رَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِہِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِہِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ ۔ (النساء:۲۳)

اورتمہارے لئے حرام ہیں وہ لڑکیاں جوتمہارے پرورش میں ہو،تمہاری ان عورتوں سے جن سے تم صحبت کرچکے ہواوراگرتم نے ان سے صحبت نہ کی ہوتو ان کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

لیکن کیااس معاملے میں مقدمات جماع یعنی بوس وکنار کرنا،شہوت کی وجہ سے چھونا وغیرہ بھی جماع کے حکم میں شامل ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ، مالکؒ،ثوریؒ، اوزاعیؒ اورلیث بن سعدؒ کے نزدیک مقدمات جماع کا بھی وہی حکم ہے جو جماع کا ہے، امام شافعیؒ اورامام احمدؒ سے بھی ایک قول اس کے مطابق منقول ہے، اس کے برخلاف امام شافعیؒ اوراحمدؒ کی دوسری رائے یہ ہے کہ اس کے ذریعہ حرمت ثابت نہیں ہوگی ،شوافع اورحنابلہ کے یہاں یہی قول راجح ہے،(۱) علامہ ابن رشدؒ کہتے ہیں کہ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ آیت میں مذکور لفظ ''دخول'' سے وطی مراد ہے یا لطف اندوزی اورلذت چشی ،اگروطی مراد ہےتو پھرحرمت کے لئے صحبت ضروری ہےاوراگرلطف اندوزی مراد ہےتواس کے لئے بوس وکناروغیرہ کافی ہے۔(۲)

۲-مملوکہ باندی سے جماع یا مقدمات جماع

مملوکہ باندی سے صحبت کرلی گئی تو اس کےقریب ترین رشتہ دارمرد کے لئے اورمرد کےقریب ترین اس کے لئے حرام ہوجائیں گے،اس پرتمام لوگوں کا اتفاق ہے،اگرمملوکہ باندی کے ساتھ محض بوس وکناروغیرہ کیا گیا ہےتواس کی وجہ سےحرمت مصاہرت ثابت ہوگی یا نہیں؟اس میں قدرے اختلاف ہے،قاسم بن محمدؒ،حسن بصریؒ، مکحول شامیؒ،نخعیؒ،شعبیؒ، اوزاعیؒ، مالکؒ، ابوحنیفہؒ کے نزدیک مقدمات جماع سے بھی حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی،امام شافعیؒ اورامام احمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے،صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اورعبداللہ بن عمروؓ وغیرہ سے یہی منقول ہےاوران دونوں اماموں کی دوسری رائے یہ ہے کہ مقدمات جماع کی وجہ سے حرمت ثابت نہیں ہوگی،(۳) جولوگ حرمت کے قائل ہیں ان کے دلائل یہ ہیں :

(۱) دیکھئے: بدایۃ المجتہد:۲/۳۳،المغنی:۶/۵۸۰،فتح الباری:۹/۱۵۸۔

(۲) بدایۃ المجتہد:۲/۳۲۔ (۳) المغنی:۶/۵۵۰،المجموع:۱۶/۲۳۰۔

۱- ابن عباسؓ سے مرسلاً منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

من نظر الی فرج امرءة لم تحل له امها ولابنتها۔ (۱)

جوکوئی کسی عورت کی شرمگاہ کو دیکھ لے تو اس کے لئے اس کی ماں اور بیٹی حلال نہیں ہے۔

۲- عمرو بن شعیبؒ کی سند سے منقول ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا :

انه جرد جاريته له ثم سالها اياه بعض ولده فقال : انها لا تحل لک۔ (۲)

اپنی ایک باندی کو بے لباس کیا اور پھر اس سے الگ ہوگئے، ان کے لڑکوں میں سے کسی نے کہا کہ اسے تحفہ کے طور پر دے دیں تو انھوں نے کہا کہ وہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔

۳- حضرت مکحولؒ نقل کرتے ہیں کہ :

ان عمر جرد جاريته فساله اياها بعض ولده فقال انها لا تحل لک۔ (۳)

حضرت عمرؓ نے اپنی باندی کو بے لباس کیا؛ لیکن پھر کسی وجہ سے ضرورت پوری کئے بغیر اس سے الگ ہوگئے، ان کے کسی لڑکے نے خواہش کی کہ وہ باندی انھیں دے دی جائے تو انھوں نے کہا کہ وہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے واقعہ کو امام مالکؒ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

ان عمر بن الخطاب وهب لابنه جارية فقال لا تمسها فانى قد كشفتها۔ (۴)

حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو ایک باندی تحفے میں دی اور کہا اس سے صحبت مت کرنا؛ کیوں کہ میں اس کا کپڑا اُتار چکا ہوں۔

۴- حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ :

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/۴۸۰۔ (۲) مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/۴۸۱۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/۴۸۰۔ (۴) مؤطا امام مالک: ۲۸۷۔

ایما رجل جرد جاریته فنظر منها الی ذالک الامر فانها لا تحل لابنه ۔ (۱)

جوکوئی اپنی باندی کو بے لباس کرکے اس کی شرمگاہ کو دیکھ لےتو وہ اس کے بیٹے کے لئے حلال نہیں ہے۔

۵- جماع کی طرح سے مقدمات جماع سے بھی لذت حاصل کی جاتی ہے؛ اس لئے ثبوت حرمت کے معاملے میں وہ جماع کے درجے میں ہوگا۔ (۲)

جولوگ مقدمات جماع کی وجہ سے حرمت مصاہرت کے ثبوت کے قائل نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ شہوت کے ساتھ چھونے وغیرہ سے غسل واجب نہیں ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے حرمت بھی ثابت نہیں ہوگی، جیسے کہ شہوت کے بغیر چھونے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے، اوراس لئے بھی کہ ثبوت حرمت کے لئے کوئی آیت یا روایت ہونی چاہئے یا ان پر قیاس، اوراس معاملے میں نہ تو شریعت میں کوئی صراحت ہے اور نہ قیاس، اور نہ ہی اس پر تمام لوگوں کا اجماع ہے؛ کیوں کہ صحبت سے بہت سے احکام متعلق ہوتے ہیں، جیسے کہ مہر واجب ہونا، غسل فرض ہونا، عدت گذارنا اور احرام وصیام کا فاسد ہوجانا اور شہوت کے لئے نہ چھونے کی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے۔ (۳)

رہی مذکورہ حدیث تو وہ ضعیف ہے اور اگر صحیح مان بھی لیا جائے تو صریح نہیں؛ کیوں کہ احتمال ہے کہ شرمگاہ دیکھنے سے مراد صحبت ہو، اسی طرح سے صحابہ کرام سے منقول اقوال میں بھی صحبت مراد لینے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ عام طور پر جماع کے لئے کنائی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور کپڑا اُتارنا اور بے لباس کرنا جماع کے لئے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے؛ البتہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ بالکل واضح ہے، اسی طرح سے ان کے بیٹے سالم کا طرز عمل اور فتویٰ اس سے بھی زیادہ صریح ہے جس میں جماع مراد لینے کی گنجائش نہیں ہے، (۴) یہی حال حضرت مسروق کے فتوے کا بھی ہے، (۵) اور ظاہر ہے کہ ان کا فتویٰ صحابہ کرام کے ارشاد وعمل سے ماخوذ ہے۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ:۹/ ۳۷۔ (۲) المغنی:۶/ ۵۸۰۔ (۳) المغنی:۶/ ۵۸۰۔

(۴) روایت کے الفاظ یہ ہیں:''وهب سالم بن عبدالله لابنه جارية فقال لا تقربها فانی قد اردتها فلم انشط اليها''مؤطا:۲۸، ان ابا نهشل بن الأسود قال للقاسم بن محمد انی رأیت جارية لی منكشفا عنها وهی فی القمر فجلست منها مجلس الرجل من امراته فقالت انی حائض فقمت فلم اقربها بعد أفاهبها لابن يطوءها؟ فنهاه القاسم عن ذالک مؤطا:۲۸۷۔

(۵) كتب مسروق الی اهله انظروا جاريتی فلانه فبيعوها فانی لم اصب منها الا ماحرمها علی ولدی من اللمس والنظر، احکام القرآن للجصاص:۳/ ۶۲۔

۳- نکاح وملکیت کے شبہ کی وجہ سے جماع یا مقدمات جماع

نکاح وملکیت میں شبہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی عورت کو اپنی بیوی یا باندی سمجھ کر اس سے جماع کرلے، جیسے کہ شادی کی پہلی رات میں دُلہن بھول جائے اور وہ اسے اپنی بیوی سمجھ کر صحبت کرلے یا نکاح فاسد وغیرہ کے بعد صحبت کر گذرے تو ایسی حالت میں بہ اتفاق حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی، علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں :

الوطء بالشبهة وهو الوطء فی نكاح فاسد أو شراء فاسد ووطء امرأة ظنها امرأته أو امته أو وطء الأمة المشتركة بينه وبين غيره وأشباه هذا ، يتعلق به التحريم كتعلقه بالوطء المباح اجماعاً ، قال ابن المنذر أجمع كل من نحفظ منه من علماء الأمصار على أن الرجل إذا وطء إمرأة بنكاح فاسد أو بشراء فاسد أنها تحرم على ابيه وابنه ۔ (۱)

اور اگر کسی کو اپنی بیوی یا باندی سمجھ کر یا نکاح فاسد کے بعد مقدمات جماع کا ارتکاب کرلے تو کیا حرمت مصاہرت ثابت ہوگی؟ سابقہ مسائل کی طرح سے اس مسئلہ میں بھی دو طرح کی رائیں ہیں، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ایک قول یہی ہے اور ان دونوں اماموں کا دوسرا قول یہ ہے کہ حرمت ثابت نہیں ہوگی؛ چنانچہ فقہاء مالکیہ لکھتے ہیں :

و إن حاول تلذذاً بزوجته فتلذذ بإبنتها فتردد ای من اراد ان يلتذذ من بزوجته فی الظلام أو غيره فوقعت يده على ابنتها منه أو من غيره ولم يشعر بها فقد تردد الاشياخ فی ذالک ۔

اس کے بعد لکھا گیا ہے کہ جمہور مالکیہ کے نزدیک مذکورہ صورت میں حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی؛ البتہ سحنون کے نزدیک ثابت نہیں ہوگی، بعض مالکی علماء نے اسی کو ترجیح دی ہے۔(۲)

اور علامہ نوویؒ شافعی لکھتے ہیں :

و إن باشر إمرأة دون الفرج بشهوة فی ملک أو شبهة بأن قبلها أو لمس شيئا من بدنها فهل يتعلق بذالک تحريم المصاهرة وتحرم عليه الربيبة على التأبيد ؟ فيه قولان : أحدهما يتعلق

(۱) المغنی: ۷/ ۵۷۷۔ (۲) الدرر فی شرح المختصر: ۲/ ۹۲۔

به التحريم وبه قال ابوحنيفة ومالک ، وقالا : انه روى عن عمر بن الخطاب ﷺ وليس له مخالف من الصحابة ولأنه تلذذ بمباشرة فتعلق به تحريم المصاهرة العربية كالوطى ، والثانى ، لا يتعلق به تحريم المصاهرة ولا الربيبة ، وبه قال احمد بن حنبل لقوله تعالىٰ : وربائبكم التى فى حجوركم من نساءكم التى دخلتم بهن ، وهذا ليس بدخول ، ولأنه لمس لا يجب الغسل فلم يتعلق به تحريم ۔ (۱)

زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت

علامہ ابن ہمامؒ کی نقل کے مطابق حضرت عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عمران بن حصینؓ اور زیادہ صحیح قول کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۲) اور جمہور تابعین جیسے حضرت حسن بصریؒ، شعبیؒ، نخعیؒ، اوزاعیؒ، طاؤسؒ، مجاہدؒ، سعید بن مسیبؒ اور سلیمان بن یسارؒ کے نزدیک زنا سے بھی حرمت مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے، اور فقہ وحدیث کے اماموں میں سے امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ بھی اس کے قائل ہیں، (۳) اور امام مالکؒ کا بھی ایک قول یہی ہے اور بعض مالکی علماء نے اسے راجح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن ابی حبیب نے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ نے مؤطا میں مذکور رائے سے رُجوع کرلیا تھا اور زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت کے قائل ہوگئے تھے اور یہی ان کی آخری رائے تھی۔ (۴)

اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دوسرا قول یہ منقول ہے کہ زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی، حضرت سعید بن مسیبؒ، یحییٰ بن یعمرؒ، عروہؒ اور زہریؒ اسی کے قائل ہیں اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے، (۵) اور امام مالک کی دوسری رائے یہی ہے، جسے عام طور پر مالکی علماء نے راجح قرار دیا ہے؛ (۶) چنانچہ وہ مؤطا میں رقم طراز ہیں :

(۱) المجموع: ۱۶/ ۲۳۰۔ (۲) حضرت ابوہریرہؓ بھی اسی کے قائل ہیں، صحیح بخاری مع الفتح: ۹/ ۱۵۴۔

(۳) فتح القدیر: ۳/ ۲۱۹، ردالمحتار: ۴/ ۱۰۷، المغنی: ۶/ ۱۵۴۔

(۴) دیکھئے: شرح جامع الامہات: ۷/ ۸۷، المناہل الزلالۃ: ۳/ ۱۴۴۶۔

(۵) المغنی: ۶/ ۵۷۶، حضرت سعید بن مسیبؒ اور عروہ بن زبیرؒ سے صحیح سند کے ساتھ حرمت کا قول بھی منقول ہے، دیکھئے: المحلی: ۹/ ۱۴۸، الجواہر النقی: ۷/ ۱۶۹، اسی طرح سے امام زہریؒ سے بھی ایک قول حرمت کا منقول ہے، دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبہ: ۴/ ۱۷۹۔

(۶) دیکھئے: الدرر فی شرح المختصر: ۲/ ۹۲۰۔

فأما الزنا فإنه لا یحرّم شیئا من ذالک ؛ لأن الله تبارک وتعالیٰ قال : وامهات نساءکم فإنما حرّم ماکان تزویجاً ولم یذکر تحریم الزنا ... فهذا الذی سمعت ، والذی علیه أمر الناس عندنا۔ (۱)

منکرین کے دلائل

جولوگ زنا کے ذریعہ حرمت مصاہرت کے قائل نہیں ہیں، ان کے دلائل یہ ہیں :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ اُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ ۔ (النساء:۲۴)

اوران کے سوا تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔

جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے ان کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ ان کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں اور ظاہر ہے کہ محرمات میں زنا کردہ عورت کے رشتہ داروں کو شمار نہیں کیا گیا ہے، اس لئے اس کے اُصول وفروع بھی حلال عورتوں میں شامل ہوں گی ، یہ آیت عام ہے اور اس کے برخلاف جو دلائل ذکر کئے جاتے ہیں ان میں اتنی قوت وصلاحیت نہیں ہے کہ ان کے ذریعہ اس میں تخصیص کی جاسکے :

فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۔ (النساء:۳)

توجوعورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو: دودو، تین تین، چار چار۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً ہر عورت سے نکاح کرنا حلال ہے الا یہ کہ حرمت کے لئے کوئی دلیل موجود ہو، غرضیکہ حلال ہونا اصل ہے اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور حرام ہونا خلاف اصل ہے، اس لئے اس کے ثبوت کے لئے دلیل کی ضرورت ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۔ (الفرقان:۵۴)

وہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا اور پھر اس کو نسب اور سسرالی رشتہ عطا کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نسبی اور سسرالی رشتہ کو بطور انعام واحسان ذکر کیا ہے اور جس طرح سے نسبی رشتہ زنا کے ذریعہ ثابت نہیں ہوتا ہے، اسی طرح سے سسرالی رشتہ بھی زنا کے ذریعہ ثابت نہیں ہوسکتا ہے اور اس لئے بھی کہ مصاہرت اللہ نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو جائز طریقے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔(۲)

(۱) المؤطاء:۲۸۴۔ (۲) دیکھئے: کتاب الام:۵/۲۶۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ :

سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الرجل يتبع المرءة حراما أينكح ابنتها أو يتبع الإبنة حراما أينكح أمها ؟ قالت : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لا يحرّم الحرام الحلال إنما يحرّم ما كان بنكاح حلال ۔ (۱)

اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے حرام کا ارتکاب کرلے تو کیا وہ اس کی بیٹی سے نکاح کرسکتا ہے؟ یا بیٹی سے حرام کا ارتکاب کرلے تو اس کی ماں سے نکاح کرسکتا ہے؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا: حلال کو حرام کاری حرام نہیں کرسکتی ہے اور صرف حلال نکاح کے ذریعہ ہی حرمت ثابت ہوسکتی ہے۔

یہ روایت حد درجہ ضعیف بلکہ قریب بہ موضوع ہے، اس کے ایک راوی عثمان بن عبدالرحمٰن کے بارے میں ابن حبانؒ کا کہنا ہے کہ وہ ثقہ لوگوں کی طرف نسبت کرکے موضوع روایتیں نقل کیا کرتا تھا اور یحییٰ بن معینؒ نے اسے جھوٹا اور دوسرے ناقدین حدیث نے اسے متروک قرار دیا ہے اور اس سے نقل کرنے والا شخص مغیرہ بن اسماعیل مجہول ہے، (۲) اس لئے اس سے استدلال درست نہیں ہے اور اگر صحیح مان لیا جائے تو بھی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص کسی عورت کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اسے دیکھتا اور پھسلاتا ہے تو اس حرام کام کی وجہ سے عورت اس کے لئے حرام نہیں ہوگی اور سوال کرنے کا منشاء یہ ہے کہ احادیث میں دیکھنے وغیرہ کو زنا کہا گیا ہے، اس لئے خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دیکھنے اور پھسلانے کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوجائے گی، آنحضور ﷺ نے اسی وہم کی تردید فرمائی۔ (۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا :

لا يحرم الحرام الحلال ۔ (۴)

حرام کاری کسی حلال کو حرام نہیں کرسکتی ہے۔

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی: ۷/۱۶۹، معمر بن راشد کہتے ہیں کہ میں نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہا آپ لا يحرم الحرام الحلال والی روایت میں ﷺ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں تو انھوں نے شدت کے ساتھ اس سے انکار کیا اور کہا میں نے صرف اسے عام لوگوں سے عام لوگوں سے سنا ہے: ''فانكر ان يكون حدثه عن النبي ولكن سمعه من أناس من الناس'' مصنف عبدالرزاق: ۷/۱۹۹۔

(۲) دیکھئے: سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ: ۳۸۸۔ (۳) احکام القرآن: ۳/۳۵۵۔ (۴) سنن ابن ماجہ: ۲۰۱۵۔

یہ حدیث بھی ضعیف اور نا قابل استدلال ہے، اس کے ایک راوی اسحاق بن محمد کو امام نسائی نے متروک اور امام ابوداؤد نے بہت زیادہ کمزور قرار دیا ہے، بعض محدثین نے ان کے معاملے میں کچھ نرم رویہ اختیار کیا ہے؛ لیکن ان کے نزدیک بھی یہ بہت زیادہ لائق اعتماد نہیں ہیں اور ان کے شیخ عبداللہ بن عمر عمری کے متعلق امام بخاری کہتے ہیں کہ ''ذاهب لا اروی منه شیئا'' اور امام نسائی کہتے ہیں کہ ضعیف الحدیث ہے اور حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ضعیف عابد، گرچہ بعض لوگوں نے انھیں معمولی درجے میں ثقہ قرار دیا ہے۔(۱)

سندی حیثیت سے کسی درجے میں لائق استدلال مان بھی لیا جائے تو معنوی اعتبار سے اس کی عمومیت کو برقرار رکھنا مشکل ہے کہ کوئی حرام چیز کسی حلال کو حرام نہیں کرتی؛ کیوں کہ بہت سی حرام چیزیں حلال کو حرام کردیتی ہیں، جیسے کہ پاک پانی میں شراب یا ناپاک چیز ڈال دی جائے تو وہ حرام اور ناپاک ہوجائے گا، نیز مشرکہ یا مشترکہ باندی سے یا حیض کی حالت میں عورت سے جماع کرنا حرام ہے؛ لیکن اس کے باوجود حرمت مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے، اس لئے حدیث کو عام نہیں رکھا جاسکتا ہے؛ بلکہ خاص شکل مراد ہے جو حضرت عائشہؓ سے حدیث میں مذکور ہے، یعنی محض دیکھنے یا پھسلانے یا پیچھے پڑنے کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوگی۔

ابن شہاب زہریؒ نقل کرتے ہیں کہ :

> وسئل عن رجل وطی ام امرأته قال قال علی بن ابی طالب ؛ لا یحرم الحرام الحلال ۔ (۲)
>
> حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کی ماں سے صحبت کرلے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ حرام کاری کسی حلال کو حرام نہیں کرسکتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس طرح کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: ''لا تحرم علیه امرأته'' (۳) اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے بقول اس کی سند صحیح ہے؛ (۴) لیکن ان سے منقول دوسرا فتویٰ اس کے برخلاف ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں :

> أن رجلا قال : أنه اصاب ام امرأته فقال له ابن عباس : حرمت

(۱) دیکھئے: تہذیب التھذیب:۱/ ۱۲۷، میزان الاعتدال:۱/ ۱۹۸، الکاشف:۱/ ۲۳۸، تہذیب التھذیب:۲/ ۳۸۸، وغیرہ۔

(۲) السنن الکبریٰ:۷/ ۱۶۸، نیز دیکھئے: صحیح بخاری مع الفتح:۹/ ۱۵۴۔

(۳) السنن الکبریٰ:۷/ ۱۶۸، نیز دیکھئے: صحیح بخاری مع الفتح:۹/ ۱۵۴۔

(۴) فتح الباری:۹/ ۱۵۶۔

علیک امرأتک و ذالک بعد أن ولدت منه سبعة أولاد وکلهم بلغ مبلغ الرجال ۔(۱)

ایک شخص نے پوچھا کہ اس نے اپنی بیوی کی ماں سے بدکاری کر لی ہے تو ابن عباسؓ نے کہا تیری بیوی تجھ پر حرام ہوگئی، یہ معاملہ اس وقت پیش آیا جب کہ اس عورت سے اس کے سات بچے پیدا ہو چکے تھے اور سب بڑے ہو چکے تھے۔

لیکن اس کی سند صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے راوی ابونصر کا سماع ابن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے، جیسا کہ امام بخاری وغیرہ نے لکھا ہے۔(۲)

نکاح صحیح اور ملکیت یا نکاح فاسد میں صحبت کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان اُمور کی وجہ سے عورت سے ہم بستری مان لی جاتی ہے اور زنا کی وجہ سے ہم بستری نہیں مانی جاتی ہے، اس لئے اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، اور اس بات کہ دلیل کی حرمت مصاہرت کی علت ہم بستری اور ثبوت نسب ہے یہ آیت ہے :

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۔ (الفرقان:۵۴)

اور اللہ ہی نے پانی سے انسان کو پیدا کیا اور پھر نسبی اور سسرالی رشتہ عطا کیا۔

اس آیت میں نسب اور سسرالی رشتہ کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دونوں کی تحقیق میں اصل کردار پانی کا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سسرالی رشتہ بھی اسی صورت میں ثابت ہوگا جس سے کہ نسب ثابت ہوتا ہے اور جس شکل میں نسب ثابت نہیں ہوگا اس میں سسرالی رشتہ بھی ثابت نہیں ہوگا۔(۳)

قائلین کے دلائل

جو لوگ زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت کے قائل ہیں ان کے دلائل یہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا ۔ (النساء:۲۲)

(۱) حوالہ سابق، نیز دیکھئے: تغلیق التعلیق: ۴/۴۰۵۔

(۲) امام ابن جریر طبریؒ نے صحیح سند کے ساتھ لکھا ہے کہ ابونصر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے والفجر ولیال عشر کا معنی پوچھا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ سے ان کا روایت سننا ثابت ہے، اس لئے امام بخاری کے عدم علم کا اعتبار نہیں ہے، دیکھئے: تفسیر طبری: ۱۵/۲۱۰۔

(۳) دیکھئے: المجموع: ۱۶/۲۲۱۔

اور جن عورتوں کو تمہارے باپ نکاح میں لا چکے ہیں تم ان کو نکاح میں نہ لاؤ، مگر جو کچھ
ہو چکا وہ ہو چکا، بے شک یہ بے حیائی اور نہایت قابل نفرت بات تھی اور بہت ہی بُرا
طریقہ تھا۔

عربی زبان میں ''نکح'' کے اصل معنی دو چیزوں کو ملانے اور جمع کرنے کے ہیں، اس اعتبار سے صحبت و جماع کرنا نکاح کا حقیقی مفہوم ہوگا؛ کیوں کہ اس حالت میں مرد و عورت باہم مل جاتے ہیں اور عقد نکاح اس کا مجازی معنی ہوگا؛ کیوں کہ یہ جمع ہونے کا سبب ہے اور مذکورہ آیت میں حقیقی معنی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے جنسی تعلق قائم کرلے تو اس کے بیٹے کے لئے اس سے نکاح کرنا حرام ہے اور چاہے یہ تعلق جائز ہو یا ناجائز بہر صورت حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی؛ کیوں کہ آیت بالکل عام ہے اور حلال وحرام نہیں؛ بلکہ اجماع سے ثابت ہے۔

اور اگر عقد کا معنی مراد ہو تو بھی لفظ عام ہے اور ہر طرح کے نکاح کو شامل ہے، خواہ نکاح جائز ہو یا ناجائز اور اس کے نزول کے وقت نکاح کی بہت سی ایسی صورتیں رائج تھیں جو محض زنا تھیں، حضرت عائشہؓ سے منقول ایک روایت میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں چار قسم کے نکاح ہوتے تھے جن میں سے تین زنا تھے، (۱) اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے کسی بھی طرح کا نکاح کیا ہو، تم اس سے نکاح نہ کرو چاہے وہ نکاح زنا ہی کیوں نہ ہو۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ نکاح کا اصل معنی جماع کے ہیں اور یہ لفظ اس معنی میں قرآن میں استعمال ہوا ہے اور اسی طرح سے اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ کتاب وسنت اور شریعت میں یہ لفظ زیادہ تر عقد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور یہی مفہوم زیادہ رائج اور مشہور ہے؛ لیکن کیا مذکورہ آیت میں حقیقی معنی مراد ہے یا رائج اور مشہور معنی؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

علامہ خلیل احمد سہارنپوری مشہور ماہر لغت ابن الفارس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں عقد مراد ہے، سوائے اس آیت کے :

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۔ (النساء:۶)

اور یتیموں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔

(۱) صحیح بخاری: ۵۱۲/۷۔

کہ اس میں نکاح سے مراد بالغ ہونا ہے،(۱) اور علامہ زمخشریؒ (۲) کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں لفظ نکاح صحبت کے معنی میں صرف اس ایک آیت میں استعمال ہوا ہے۔(۳)

حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۔ (البقرۃ:۲۳۰)

یہاں تک کہ وہ دوسرے شوہر سے صحبت کرلے۔

اور مشہور محقق علامہ ابن نجیم مصریؒ کہتے ہیں :

ولم يستدل بقوله تعالٰى ولا تنحكوا مانكح أباءكم كما فعل الشارحون لما قدّمنا أنه لا يصلح الإستدلال به ۔ (۴)

صاحب کتاب نے اللہ تعالیٰ کے قول:''وَ لَا تَنْكِحُوْا'' سے استدلال کیا ہے، جیسا کہ عام طور پر شرح کرنے والوں نے ایسا کہا ہے؛ کیوں کہ ہم اس سے پہلے واضح کرچکے ہیں کہ اس سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

نیز آگے لکھتے ہیں :

فالحاصل أن الأولى أن النكاح في الاية العقد كما هو مجمع عليه ويستدل لثبوت حرمة المصاهرة بالوطي الحرام بدليل آخر ۔ (۵)

حاصل یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں لفظ نکاح کو عقد کے معنی میں لیا جائے، جیسا کہ اس پر اجماع ہے اور زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت کے ثبوت کے لئے دوسری دلیل سے استدلال کیا جائے۔

مذکورہ آیت میں لفظ نکاح سے عقد مراد ہونے کی وجہ پر علامہ ابن ہمام نے بڑے اچھے اور اُصولی انداز میں گفتگو کی ہے، ان کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہونا اور زنا کے ذریعہ اس کے ثبوت میں اختلاف کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ آیت پہلے مسئلہ کے لئے بالکل واضح ہے، اس لئے اس میں کوئی اختلاف نہیں اور دوسرے مسئلے کے لئے واضح نہیں ہے، اس وجہ سے اس میں اختلاف ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں :

(۱) بذل المجهود:۱۰/۴۔

(۲) علامہ ابن عابدین شامی زمخشریؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:''لان الزمخشری من مشائخ المذهب وهو حجة في النقل''، ردالمحتار:۴/۱۰۵۔ (۳) الفقه الاسلامی وادلته:۹/۶۵۱۵۔

(۴) البحرالرائق:۳/۱۷۴۔ (۵) البحرالرائق:۳/۱۶۷۔

وليس لک ان تقول ثبتت حرمة الموطؤة بالأية والمعقود عليها بلا وطی بالإجماع لأنه إذا كان الحكم الحرمة بمجرد اللفظ ولفظ الدليل صالح له كان مرادا منه بلا شبهة فأن الأجماع تابع النص والقياس ۔ (۱)

عقد مراد لینے کے لئے دوسرا واضح قرینہ یہ ہے کہ لفظ ''لَا تَنْكِحُوْا'' سے بہ اتفاق عقد مراد ہے تو ''مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ'' سے بھی یہی مراد ہونا چاہئے، نیز اس کے علاوہ بھی بعض صورتوں میں محض نکاح کی وجہ سے اور بعض میں نکاح کے بعد صحبت کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے اور اس کے لئے قرآن حکیم میں تین الفاظ استعمال کئے گئے ہیں :

۱- ''اُمَّهَاتُ نِسَآئِكُمْ'' (تمہاری عورتوں کی مائیں یعنی ساس)۔

۲- ''وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ'' (تمہارے بیٹیوں کی بیویاں یعنی بہو)۔

۳- ''وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ'' (وہ لڑکیاں جو تمہاری پرورش میں ہوں)۔

اور لغت اور عرف واستعمال کے اعتبار سے زانیہ کے لئے ''نساء'' یا ''حلیلۃ'' اور اس کی لڑکی کو ''ربیبہ'' نہیں کہا جاتا ہے؛ بلکہ یہ الفاظ انھیں عورتوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، جن سے نکاح ہوا ہو، تو جس طرح سے مذکورہ الفاظ سے نکاحی عورت مراد ہے، اسی طرح سے لفظ ''نکاح'' سے بھی عقد نکاح مراد ہے۔

ابوحانی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

من نظر الی فرج امرءة لم تحل له امها ولا بنتها ۔ (۲)

جو شخص کسی عورت کی شرمگاہ کو دیکھ لے تو اس کے لئے اس کی ماں اور بیٹی حلال نہیں ہے۔

یہ حدیث ابوہانی تابعی سے صحابی کے واسطہ کے بغیر منقول ہے، اس لئے مرسل روایت ہے، اور اس طرح کی حدیث حنفیہ مالکیہ اور دوسرے بہت سے فقہاء ومحدثین کے نزدیک لائق استدلال ہے؛ البتہ اس کے ایک راوی حجاج بن ارطاۃ پر کلام کیا گیا ہے؛ لیکن بعض لوگوں نے انھیں ثقہ کہا ہے، اس اعتبار سے ان کی حدیث درجہ حسن سے کمتر نہیں؛ لیکن ان کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ غلطی کیا کرتے تھے، نیز تدلیس کے بھی عادی تھے، یعنی ضعیف راویوں کو درمیان سے اس طرح سے حذف کر دیتے کہ پتہ نہیں چلتا؛ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں :

---

(۱) فتح القدیر: ۲۱۱/۳۔ (۲) مصنف ابن ابی شیبہ: ۴۸۰/۳۔

احد الفقهاء صدوق ، کثیر الخطأ والتدلیس ، وکان یدلّس عن الضعفاء ۔ (۱)

اور تدلیس کرنے والے راوی کی مرسل روایت یا ایسی حدیث جسے عن فلان عن فلان کے ذریعہ بیان کیا گیا ہو، لائق قبول نہیں ہے، اس لئے روایت ضعیف ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ کا کہنا ہے۔ (۲)

دوسرے یہ کہ حدیث اپنے موضوع پر صریح بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ احتمال ہے کہ شرمگاہ دیکھنے سے مراد حلال صحبت ہو؛ کیوں کہ جماع کے لئے عام طور پر کنائی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور عورت سے مراد بیوی ہو اور مطلب یہ ہو کہ جس نے اپنی بیوی سے جماع کرلیا تو اس کی وجہ سے اس کی ماں اور بیٹی دونوں حرام ہوجاتی ہیں، جب کہ نکاح کی وجہ سے صرف ماں حرام ہوتی ہے، بیٹی نہیں، تو نکاح کی وجہ سے جو حرمت صرف ایک طرف تھی، وہ جماع کی وجہ سے دونوں طرف ہوجاتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ :

قال رجل : یا رسول الله ، إني زینت إمرءة في الجاهلیة أفانکح ابنتها قال : لا أری ذالک ولا یصلح ان تنکح امرأة تطلع من ابنتها علی ما تطلع علیه منها ۔ (۳)

رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ زمانہ جاہلیت میں ایک عورت سے جماع کرچکا ہوں، کیا اس کی لڑکی سے نکاح کرسکتا ہوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، میں اسے صحیح نہیں سمجھتا اور تمہارے لئے یہ بھی درست نہیں ہے کہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرو جس کی بیٹی کے جسم کے ان حصوں کو دیکھ چکا ہے جو بیوی کے جسم سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ حدیث اپنے موضوع پر بالکل صریح اور واضح ہے، کاش کہ صحیح بھی ہوتی تو پھر اس کے علاوہ کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہ ہوتی؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ بے سر پیر کی روایت ہے، منقطع بھی ہے اور اس کے راوی پر سخت کلام بھی کیا گیا ہے۔

---

(۱) تہذیب التہذیب: ۱۹۷/۲۔

(۲) فتح القدیر: ۱۹۹/۹۔

(۳) فتح القدیر: ۲۱۱/۳۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت سعد بن وقاصؓ اور عبد بن زمعہؓ کے درمیان ایک بچے کے بارے میں اختلاف ہوا، حضرت سعدؓ نے کہا: اللہ کے رسول! یہ میرے بھائی عتبہ کا لڑکا ہے، انھوں نے مجھ سے تاکید کے ساتھ کہا تھا کہ یہ ان کا بیٹا ہے، ذرا ان کے ساتھ اس کی مشابہت تو دیکھئے اور حضرت عبد بن زمعہؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ میرا بھائی ہے، میرے باپ کی باندی سے ان کے بستر پر پیدا ہوا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھا کہ اس بچے میں عتبہ کے ساتھ واضح مشابہت پائی جارہی ہے، پھر آپ نے فرمایا :

هو لک یا عبد بن زمعة ، الولد للفراش وللعاهر الحجر واحتجبی منه یا سودة ۔ (۱)

عبد بن زمعہ! یہ بچہ تمہارے لئے ہے، بچہ اس کا ہوتا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو اور زنا کرنے والے کے لئے پتھر ہے اور سودہ! تم اس سے پردہ کرو۔

اس بچے میں آنحضرت ﷺ نے عتبہ کے ساتھ مشابہت دیکھ کر یقین کرلیا کہ یہ عتبہ کا ہے اور اسی بنیاد پر حضرت سودہ کو اس سے پردہ کرنے کا حکم دیا، غرضیکہ زنا کی وجہ سے نسب تو ثابت نہیں ہوا؛ البتہ پردہ کے معاملے میں ثبوت نسب جیسا معاملہ کیا گیا اور اس سلسلے میں اسے عبد کا بھائی نہیں بلکہ عتبہ کا بیٹا قرار دیا گیا۔(۲)

یہ حدیث صحیح ہے؛ لیکن موضوع سے غیر متعلق ہے؛ کیوں کہ اس میں زمعہ سے نسب کو ثابت نہیں کیا گیا ہے؛ کیوں کہ زمعہ نے اس کا دعویٰ نہیں کیا تھا؛ بلکہ عبد بن زمعہ نے اسے اپنا بھائی قرار دینے کا دعویٰ کیا تھا اور اس کے مطابق اسے اس کا بھائی اور ترکہ میں سے اس کے حصے میں اسے شریک قرار دیا گیا، اس طرح کے مسئلہ میں حنفیہ کا یہی موقف ہے کہ اگر کوئی شخص باپ کی وفات کے بعد کسی بارے میں اعتراف کرے کہ وہ اس کا بھائی ہے تو اس کے باپ سے اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا؛ البتہ ترکہ میں سے اس کے حصہ میں وہ شریک سمجھا جائے گا۔

اس اعتبار سے وہ عبد کا بھائی مان لیا گیا؛ لیکن اسے زمعہ کا بیٹا اور حضرت سعدؓ کا بھائی نہیں تسلیم کیا گیا، اس لئے اس سے پردہ کا حکم دیا گیا؛ کیوں کہ ان کے حق میں وہ ایک اجنبی کی طرح ہے؛ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ :

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لسودة : أما الميراث فله وأما أنت فاحتجبی منه فانه لیس لک باخ ۔ (۳)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سودہؓ سے کہا وارثت میں سے اس کو حصہ ملے گا؛ لیکن تم اس سے پردہ کرو؛ کیوں کہ وہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔

(۱) صحیح بخاری: ۲۴۲۱، صحیح مسلم: ۷/۱۴۵، وغیرہ۔ (۲) الجوہر النقی: ۷/۱۷۰۔

(۳) شرح معانی الآثار: ۲/۶۶، السنن للنسائی: ۳۴۸۵۔

امام طحاویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

اگر رسول اللہ ﷺ اسے زمعہ کا بیٹا قرار دیتے تو پھر حضرت سودہ کو ان سے پردہ کرنے کے لئے نہ کہتے ؛ کیوں کہ آنحضرت ﷺ رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیتے تھے اور توڑنے سے منع کیا کرتے تھے، اور رشتہ جوڑنے میں یہ بات بھی شامل ہے، رشتہ داروں سے ملاقات کی جائے ،تو اگر رسول اللہ ﷺ اسے بھائی قرار دیتے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس سے پردہ کا حکم دیتے ، آنحضور ﷺ کے بارے میں اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے ؛ حالاں کہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کو حکم دیتے ہیں کہ رضاعی چچا کو اپنے پاس آنے دیا کریں اور سودہ کو حکم دیں کہ وہ اپنے بھائی اور اپنے باپ کے بیٹے سے پردہ کریں، یہ کیسے ممکن ہے۔(۱)

بعض لوگوں نے یہ تاویل کی ہے کہ پردہ کا حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں، اور اگر وجوبی بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی ہے کہ زنا کی وجہ سے کسی بھی درجے میں نسب کے احکام پر ثابت ہو سکتے ہیں ؛ کیوں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت سودہؓ کے لئے اجنبی تھا؛ مگر عتبہ سے کسی بھی طور پر نسب ثابت نہیں ہوتا ہے؛ کیوں کہ ایسا کرنا للعاھر الحجر (زنا کار کے لئے سنگساری ہے) کے خلاف ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی ساس سے جماع کرلے تو اس کی بیوی اس کے لئے حرام ہوجائے گی ،(۲) اسی طرح کا فتویٰ مشہور صحابی حضرت عمران بن حصینؓ سے بھی منقول ہے،(۳) اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ :

لا ینظر اللہ الی رجل نظر الی فرج امرأة وبنتها ۔ (۴)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے جو کسی عورت اور اس کی بیٹی کی شرمگاہ کو دیکھے۔

---

(۱) شرح معانی الآثار:۲/۶۶۔

(۲) صحیح بخاری مع الفتح:۹/۲۰۰۔

(۳) رواہ عبدالرزاق ولا باس باسنادہ، فتح الباری:۹/۱۹۹۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ:۳/۴۸۰۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور عمران بن حصین کا فتویٰ سند کے اعتبار سے صحیح اور موضوع کے اعتبار سے بالکل بے غبار ہے، اسی طرح سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول بھی سند کی حیثیت سے صحیح ہے، بعض لوگوں نے لیث بن ابی سلیم اور حماد بن ابی سلیمان کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دینے کی کوشش کی ہے جو غلط ہے؛ کیوں کہ ان کو ضعیف قرار دینے میں ناقدین حدیث کے درمیان اختلاف ہے؛ اس لئے ان کی روایت دوسرے درجے سے کمتر نہیں ہے؛ البتہ موضوع کے اعتبار سے صریح نہیں ہے؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ عورت کی شرمگاہ کو دیکھنے سے مراد نکاح کے ذریعہ دیکھنا ہو، یعنی نکاح کر کے اسے بے لباس کردے اور پھر طلاق کے بعد اس کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہے تو درست نہیں ہے، دوسرے یہ کہ کسی کی طرف نظر رحمت نہ کرنے سے اس کے عمل کا گناہ ہونا ثابت ہوتا ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی ہے، جیسے کہ ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ :

لا ینظر اللہ إلی رجل أتی رجلاً أو امرأۃ فی الدبر ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں کریں گے جو کسی مرد یا عورت کے پیچھے کے مقام میں بدفعلی کرے۔

یعنی ایسا کرنا حرام ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے عورت اس کے لئے حرام نہیں ہوگی اور ابن عباسؓ کی طرف عدم حرمت کی نسبت، بہت زیادہ صحیح نہیں ہے؛ بلکہ حرمت کا قول ہی راجح ہے، وجہ یہ ہے کہ ان کے مشہور شاگردوں کی رائے یہ ہے کہ زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی، جیسے کہ حضرت عطا اور طاؤس وغیرہ کی رائے ذکر کی جاچکی ہے اور حضرت عطاؒ ان کے اس قول کی تاویل کیا کرتے تھے: ''لایحرّم حرام حلالاً'' (حرام کاری کسی حلال کو حرام نہیں کرسکتی)۔

کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی کسی عورت سے زنا کرلے تو وہ اس کے لئے حرام نہیں ہوجائے گی؛ بلکہ اس سے نکاح کرنا درست ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عکرمہؓ نے ان سے عدم حرمت کا جو قول نقل کیا ہے، وہ حضرت عطا کے نزدیک ثابت نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر وہ صحیح ہوتا تو پھر ان کے مذکورہ قول کی تاویل نہیں ہوسکتی ہے، (۲) اور خود حضرت عکرمہؓ کا فتویٰ بھی اس کے برخلاف ہے؛ چنانچہ ان سے دریافت کیا گیا :

---

(۱) ترمذی: ۱۱۶۵۔ (۲) احکام القرآن للجصاص: ۳/ ۵۲، مصنف عبدالرزاق میں ان سے منقول الفاظ یہ ہے:
''سئل عطاء عن رجل کان یصیب امرأۃ سفاحاً أینکح ابنتھا؟ قال: ''لا، وقد اطلع علی فرج امھا'' فقال إنسان ألم یقال: لا یحرم حرام حلالا ؟ قال: ذالک فی الامۃ کان یبغی بھا، ثم یبتاعھا، او یبغی بالحرۃ، ثم ینکحھا فلا یرحم حینئذ ماکان صنع من ذالک''
مصنف عبدالرزاق: ۷/ ۱۹۷، سند صحیح ہے۔

رجل فجر بامرءة أيصلح له ان يتزوج جارية ارضعتها هي بعد ذالک، قال : لا ۔ (۱)

کسی نے ایک عورت سے بدکاری کی اور پھر اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جسے اس عورت نے دودھ پلایا ہے تو کیا یہ درست ہے، حضرت عکرمہ نے کہا نہیں۔

اور ان کے مشہور شاگرد حضرت مجاہدؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ :

إذا قبلها أو لا مسها أو نظر الی فرجها من شهوة حرّمت عليه امها وابنتها ۔ (۲)

اگر کسی نے عورت کو شہوت سے بوسہ دے دے، ہاتھ لگادے یا اس کی شرمگاہ کو دیکھ لے تو اس پر اس کی ماں اور بیٹی حرام ہوجائے گی۔

غرضیکہ متعدد صحابہ کرام سے زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت کے ثبوت کا فتویٰ منقول ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی سے اختلاف مذکور نہیں ہے اور ان سے بھی دوطرح کا قول نقل کیا جاتا ہے؛ مگر ثبوت حرمت کا قول اس اعتبار سے راجح معلوم ہوتا ہے کہ وہی ان کے نمایاں شاگردوں کی رائے ہے، اور تابعین میں سے اکثر لوگ حرمت کے قائل ہیں، حضرت سعید بن مسیبؒ اور عروہ بن زبیرؓ سے عدم حرمت کا فتویٰ نقل کیا جاتا ہے؛ لیکن ان سے بھی حرمت کا فتویٰ ثابت ہے، (۳) اس لئے اگر کسی نے یہ کہا ہے تو غلط نہیں کہا ہے کہ :

وبهذا قال جمهور الصحابة والتابعين ۔ (۴)

حرمت مصاہرت کی حقیقی علت اور وجہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل اور بنیادی وجہ جماع ہے، خواہ اس کی نوعیت درست ہو یا نہ ہو، عقد نکاح یا حلال جماع کو اصل علت قرار نہیں دے سکتے؛ کیوں کہ کسی عورت سے محض عقد کی وجہ سے اس کی بیٹی حرام نہیں ہوتی، اگر عقد سبب ہوتا تو سوتیلی بیٹی محض نکاح کی وجہ سے حرام ہوجاتی؛ البتہ اگر ماں سے صحبت کرلی جائے تو پھر سوتیلی بیٹی حرام ہوجاتی ہے، معلوم ہوا کہ نکاح کے بجائے حرمت کا سبب جنسی تعلق ہے اور اس تعلق کا جائز ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ حرام طریقے پر بھی تعلق قائم کرلیا گیا تو اس سے حرمت ثابت ہوجائے گی، جیسے کہ مشرکہ یا مشترکہ باندی سے جنسی تعلق قائم کرنا حرام ہے، صیام، احرام اور حیض ونفاس کی

(۱) المحلی: ۹/ ۱۴۸۔

(۲) المحلی: ۹/ ۱۴۸۔

(۳) دیکھئے: المحلی: ۹/ ۱۴۸، تعلیق التعلیق: ۴/ ۴۰۵، الجواہر النقی: ۷/ ۱۶۹۔

(۴) فتح الملک المعبود: ۴/ ۲۸۱۔

حالت میں بھی جماع حرام ہے ؛ لیکن ان صورتوں میں جماع کر لینے سے حرمت ثابت ہوجاتی ہے، معلوم ہوا کہ حرمت کی بنیادی علت جنسی تعلق ہے، خواہ جائز ہو یا ناجائز اور زنا میں ناجائز طریقہ پر تعلق قائم کرنا پایا گیا؛ لہٰذا اس کی وجہ سے حرمت ثابت ہوجائے گی ۔(۱)

جنسی تعلق کی وجہ سے بچے کے واسطے سے مرد وعورت ایک دوسرے کا جز اور جسم کا حصہ بن جاتے ہیں ؛ کیوں کہ وہ دونوں کے نطفے سے پیدا ہوتا ہے، اس طرح سے وہ دونوں کے جسم کا حصہ ہے اور ضابطہ ہے کہ جزء کا جزء، جزء ہوتا ہے، جیسے کہ ہاتھ جسم کا ایک حصہ ہے اور اس کا ایک حصہ انگلی ہے تو انگلی جسم کا حصہ ہوئی اور ایسے ہی بچہ باپ کے جسم کا ایک حصہ ہوا اور اس کے جسم کا حصہ اس کی ماں ہے تو ماں اس کے باپ کے جسم کا حصہ ہوگئی اور پھر اس کے واسطے سے اس کی ماں یعنی ساس باپ کے جسم کا حصہ ہوگئی اور اس لئے اس سے رشتہ قائم کرنا حرام ہوتا ہے اور نسب کے ذریعہ حرمت میں بھی یہی جزئیت کارفرما ہے اور اس اُصول کی بنیاد پر بچے کی پیدائش کے بعد خود بیوی سے انتفاع حرام ہونا چاہئے ؛ کیوں کہ بچے کے واسطے سے وہ اس کے جسم کا حصہ بن چکی ہے اور اپنے جزء سے انتفاع حرام ہے؛ لیکن نسل انسانی کی بقاء کے لئے بربناء ضرورت اس کی اجازت دی گئی ہے۔

چوں کہ جزئیت ایک پوشیدہ چیز ہے جس کے بارے میں پتہ لگانا دشوار ہے، اس لئے حکم کا مدار ایک ظاہری چیز یعنی جماع پر رکھا گیا اور جماع بھی دو لوگوں کا ایک نجی معاملہ ہے، اس لئے اس کا قائم مقام نکاح کو بنا دیا گیا؛ لیکن اگر کسی جگہ حقیقی وجہ پائی جائے یعنی نکاح کے بغیر زنا کے ذریعہ بچہ پیدا ہوجائے یا اس کا قریبی سبب جماع پایا جائے تو اس سے بھی حرمت مصاہرت ثابت ہوجائے گی ۔(۲)

لیکن اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر جماع کی وجہ سے بچے کے واسطے سے مرد وعورت ایک دوسرے کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں تو زانی کے لئے زانیہ سے نکاح حرام ہونا چاہئے ؛ کیوں کہ وہ اس کے جسم کا حصہ بن چکی ہے اور اس سے نکاح کرنے کی کوئی ضرورت اور مجبوری بھی نہیں ہے۔

زنا کے معاملے میں شریعت میں بڑی سختی اور شدت برتی گئی ہے؛ چنانچہ بعض صورتوں میں اس کے مرتکب کو پتھر مار مار کر ختم کر دینے اور بعض میں سو کوڑے مارنے کا حکم ہے اور جہنم کے آگ کی وعید سنائی گئی ہے اور اس کے وجہ سے پیدا ہونے والے بچے کا نسب ثابت نہیں مانا گیا ہے، اس قدر سخت احکام اسی لئے دیئے گئے ہیں ؛ تاکہ لوگ زنا سے دُور رہیں اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کے ذریعہ حرمت مصاہرت بھی ثابت کر دی جائے ؛ تاکہ اس سختی کو

(۱) دیکھئے: احکام القرآن: ۳/ ۵۳۔

(۲) دیکھئے: تبیین الحقائق: ۲/ ۱۰۸، فتح القدیر: ۳/ ۲۲۰، المبسوط: ۴/ ۲۰۵۔

دیکھ کر اس کے قریب جانے سے لوگ بچیں، غرضیکہ زنا سے روکنے اور رشتوں کے تقدس کو برقرار رکھنے میں حرمت مصاہرت ثابت کرنے سے مدد ملتی ہے۔(۱)

حاصل کلام

حرمت مصاہرت کا معاملہ بڑا ہی پرخطر ہے؛ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ زنا کی وجہ سے ثبوت حرمت یا عدم حرمت کے معاملے میں کوئی ''صریح'' آیت یا واضح اور صحیح روایت موجود نہیں ہے اور صحابہ کرام وتابعین عظام کے اقوال دونوں طرح سے منقول ہیں، اسی طرح سے قیاس کی بنیادوں اور فکر ونظر کی جہتوں میں بھی اختلاف ہے؛ چنانچہ علامہ مناوی کہتے ہیں کہ :

> وهى مسئلة عظيمة فى الخلاف ليس فها خبر صحيح من جانبنا ولا من جانبهم ۔ (۲)
>
> یہ ایک اہم مسئلہ ہے؛ لیکن اس معاملے میں نہ تو ہمارے پاس کوئی صحیح حدیث ہے اور نہ ان کے پاس۔

لیکن حرمت کا پہلو اس اعتبار سے راجح معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں حلت وحرمت کی دلیلوں میں تعارض ہو تو احتیاط پر عمل کرتے ہوئے حرمت کی جانب کو ترجیح دی جاتی ہے۔

غرضیکہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے جس میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے، اور کسی ایک رائے کو یقینی طور پر صحیح اور اس کے برخلاف رائے کو غلط نہیں کیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ فقہ وفتاویٰ کی مشہور کتاب المحیط البرہانی میں ہے کہ :

> فأذا زنى رجل بأم امراته ولم يدخل بها فجلده القاضى ورأى أن لا يحرمها عليه فأقرها معه وقضى بذالک نفذ قضاءه لأنه قضى فى فصل مجتهد فيه فإن بين الصحابة إختلاف فى هذه الصورة ۔ (۳)
>
> اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے صحبت سے پہلے اس کی ماں سے زنا کرے اور قاضی نے ثبوت جرم کے بعد اسے کوڑے لگادیا؛ لیکن اس کی بیوی کو اس کے لئے حرام قرار نہیں

---

(۱) دیکھئے: احکام القرآن: ۳/ ۵۳۔

(۲) فیض القدیر، حدیث نمبر: ۹۹۵۷۔

(۳) المحیط البرہانی: ۸/ ۱۷، کتاب القضاء۔

دیا اور اسے اس کے ساتھ رہنے دینے کا فیصلہ کیا تو اس کا فیصلہ نافذ ہوگا، اس لئے کہ اس نے ایک اجتہادی مسئلہ میں فیصلہ کیا ہے؛ کیوں کہ صحابہ کرام کے درمیان اس صورت میں اختلاف ہے۔

اس لئے شدید مجبوری اور مخصوص حالات میں صاحب بصیرت اور دیدہ ور مفتی کے لئے امام شافعی وغیرہ کی رائے پر فتویٰ دینے کی اجازت ہوگی۔

مقدمات زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت

حنفیہ کے نزدیک شہوت کی وجہ سے بوسہ لینے، ہاتھ لگانے یا شرمگاہ کو دیکھنے سے بھی حرمت مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے، امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک رائے اس کے مطابق منقول ہے اور ان کی دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی وجہ سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے؛ چنانچہ حنابلہ کے نزدیک یہی راجح ہے اور امام مالک وشافعی کا بھی یہی مسلک ہے۔

قائلین حرمت کے دلائل یہ ہیں

۱- ابوہانی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من نظر إلى فرج امرأة لم يحل له أمها ولا ابنتها ۔(۱)

جو کسی عورت کی شرمگاہ کو دیکھ لے تو اس کے لئے اس کی بیٹی اور ماں حلال نہیں ہے۔

یہ حدیث گذر چکی ہے اور واضح کیا جا چکا ہے کہ اسنادی حیثیت سے بہت کمزور ہے، نیز اپنے موضوع پر صریح بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ امکان ہے کہ نظر سے مراد جماع اور عورت سے مراد اس کی بیوی ہو؛ کیوں کہ عام طور سے جماع کے لئے کنائی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

۲- ابن جریج نقل کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا:

الذی یتزوج المرءة فیغمزها ولا یزید علی ذالک لا یتزوج ابنتها ۔(۲)

جو کسی عورت سے نکاح کرے اور اسے دبالے اور اس کے علاوہ کچھ نہ کرے تو وہ اس کی بیٹی سے نکاح نہیں کرسکتا ہے۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/ ۴۸۔

(۲) المدونۃ: ۲/ ۲۰۱، اعلاء السنن: ۱۱/ ۳۳۔

ابن جریج تبع تابعی ہیں اور تابعی وصحابی کے واسطے کے بغیر حدیث نقل کررہے ہیں، اس لئے حدیث منقطع اور مرسل ہے اور ناقابل استدلال ہے، نیز نکاحی عورت سے متعلق ہے اس لئے مقدمات زنا کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۳- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ :

اذا قبّل لها فلا تحل له الابنة أبداً۔ (۱)

جب عورت کو بوسہ دے دے تو اس کی بیٹی اس کے لئے حلال نہیں ہے۔

۴- اس طرح کے فتوے بعض دوسرے صحابہؓ سے بھی منقول ہیں جس میں دیکھنے یا ہاتھ لگانے سے حرمت مذکور ہے؛ لیکن ان کا تعلق باندی سے ہے اور جنھیں ماقبل میں ذکر کیا جاچکا ہے۔

۵- مشہور تابعی حضرت مسروقؒ، حسن بصریؒ، قاسم بن محمدؒ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگرد، حضرت مجاہدؒ، حضرت انسؓ کے جلیل القدر شاگرد حضرت قتادہ وحاتم اور حضرت ابراہیم نخعی وغیرہ مقدمات زنا کی وجہ سے حرمت مصاہرت کے قائل ہیں، (۲) حضرت ابراہیم نخعیؒ سے منقول الفاظ یہ ہیں :

كانوا يقولون إذا اطلع الرجل على مالا تحل له أو لمسها لشهوة فقد حرّمتا عليه جميعا۔ (۳)

نیز آگے کہتے ہیں :

إذا غمز الرجل الجارية بشهوةٍ لم يتزوج أمها ولا ابنتها۔(۴)

۶- بعض حالات میں محض نکاح کی وجہ سے حرمت ثابت ہوجاتی ہے؛ کیوں کہ وہ جماع کا سبب ہے، اسی طرح سے مقدمات زنا سے حرمت ثابت ہوجائے گی؛ کیوں کہ وہ زنا کا سبب اور ذریعہ ہے اور جو حکم اصل چیز کا ہوتا ہے، وہی حکم اس تک پہنچانے والے ذریعہ کا بھی ہوا ہے؛ چنانچہ مباح کا ذریعہ مباح اور حرام کا ذریعہ حرام ہوتا ہے۔

شافعیہ وغیرہ کی دلیل اس مسئلہ میں بھی وہی ہے جو زنا سے متعلق ہے؛ کیوں کہ ان کے یہاں جب زنا سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے تو مقدمات زنا بدرجہ اولیٰ ثابت نہیں ہوگی؛ البتہ حنابلہ نے دونوں میں فرق کیا ہے کہ ان

(۱) المدونة: ۲/۲۰۱، اعلاء السنن: ۱۱/۳۳۔

(۲) دیکھئے: المحلی: ۹/۱۴۸، اعلاء السنن: ۱۱/۳۳، احکام القرآن: ۳/۶۲۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/۴۸۱۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/۳۸۱۔

کے یہاں زنا سے حرمت ثابت ہوجاتی ہے؛ مگر مقدمات زنا سے نہیں، ان کا کہنا ہے کہ ثبوت حرمت کے لئے آیت وروایت یا قیاس کی ضرورت ہے جو اس معاملے میں موجود نہیں ہے اور ثبوت کے ساتھ بوس وکنار کرنے اور ہاتھ لگانے وغیرہ کو جماع پر قیاس کرنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ جماع سے غسل، عدت کا وجوب اور احرام وصیام کا فساد لازم آتا ہے؛ لیکن دیکھنے اور چھونے سے یہ احکام ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ ۔ (النساء:۲۴)

اس کے علاوہ عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ وغیرہ لگانے سے حرمت ثابت نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اس سلسلے میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، جس کے ذریعہ مذکورہ آیت میں تخصیص کردی جائے۔

نکاح کے بعد مقدمات جماع کے پائے جانے کی وجہ سے سوتیلی بیٹی حرام ہوجاتی ہے، اسی طرح سے باندی کے ساتھ مقدمات جماع کے پائے جانے کی وجہ سے حرمت مصاہرت ثابت ہوجاتی ہے، صحابہ کرامؓ کی اکثریت اور زیادہ تر فقہاء اسی کے قائل ہیں، نکاح یا ملکیت کے شبہ کی وجہ سے مقدمات جماع کے پائے جانے کی وجہ سے بیشتر فقہاء حرمت کے قائل ہیں جس کی تفصیل گذر چکی ہے، قیاس کا تقاضا ہے کہ ان صورتوں میں مقدمات جماع کا جو حکم ہے وہی حکم مقدمات زنا کا بھی ہونا چاہئے؛ تاکہ رشتوں کی عظمت وتقدس برقرار رہے اور بے حیائی وبدکاری کو پھیلنے سے روکا جائے، اللہ کا ارشاد ہے :

وَ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ۔ (الاسراء:۳۲)

اور زنا کے پاس نہ جاؤ یقیناً وہ بے حیائی اور بدکاری ہے۔

یعنی زنا کے ساتھ زنا تک پہنچانے والے راستوں سے بھی بچو؛ کیوں کہ یہ تمہیں زنا سے قریب کردیں گے، غرضیکہ اس آیت کے ذریعہ زنا کے ساتھ مقدمات زنا سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بنیاد پر احادیث میں بدنظری اور ہاتھ لگانے کو زنا کہا گیا ہے کہ یہ چیزیں زنا تک پہنچانے والی ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس مسئلہ میں بھی حنفیہ کی رائے مضبوط بنیادوں پر قائم ہے؛ البتہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس میں بھی صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف رہا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس بات کے قائل تھے کہ نکاح کے بعد مقدمات جماع کی وجہ سے سوتیلی بیٹی حرام نہیں ہوگی، (۱) اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے

(۱) المغنی:۶/۵۷۹۔

تھے کہ کسی عورت سے حرمت مصاہرت اس وقت ثابت ہوگی جیسا کہ اسے زمین سے لگا دے یعنی جماع کر لے۔(۱)

غرضیکہ یہ مسئلہ بھی اجتہادی ہے اور احتیاط پر مبنی ہے؛ چنانچہ فتح القدیر میں ہے :

حرمة الدواعی فی هذا الباب مجتهد فیه ولم یقل بها الشافعی واکثر الفقهاء ۔ (۱)

مقدمات جماع کی وجہ سے حرمت کا حکم اجتہادی ہے اور امام شافعیؒ اور اکثر فقہاء اس کے قائل نہیں ہیں۔

اور علامہ سرخسیؒ کہتے ہیں کہ :

کثیر من الفقهاء لا یرون اللمس والتقبل موجباً للحرمة ولیس فی اثبات الحرمة ، نص ظاهر بل نوع احتیاط اخذنا به من حیث اقامة السبب الداعی الی الوطی مقام الوطی ۔(۳)

● ● ●

(۱) صحیح بخاری:۵۱۰۵۔

(۲) فتح القدیر:۱۰/ کتاب الکراهیة، فصل فی الاستبراء۔

(۳) المبسوط:۹/۱۱۷، کتاب الحدود، باب الاقرار بالزنا۔

بیع وفاء اور اس سے متعلق مسائل

خالد سیف اللہ رحمانی

شریعت کے اوامر ونواہی اور تمام احکام میں دو باتیں ملحوظ ہوتی ہیں ، ایک : شکل وہیئت ، دوسرے : مقصد ومنشاء ، عام طور پر عبادات میں خود شارع نے دونوں پہلوؤں کو متعین وواضح کر دیا ہے ، عبادت کی ہیئت وکیفیت بھی اور اس کا مقصد بھی ، جیسے نماز کی پوری ہیئت نیت اور تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک آپ ﷺ نے اپنے قول وفعل کے ذریعہ واضح فرما دی اور ہدایت بھی کر دی کہ جیسے میں نماز پڑھتا ہوں ، اسی طرح نماز پڑھا کرو : ''صلوا کما رأیتمونی اصلی'' اور مقصد بھی واضح فرما دیا ، اور وہ یہ ہے کہ انسان میں گناہوں سے بچنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے : ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ'' (العنکبوت : ۴۵) مگر معاملات کے باب میں عام طور پر مقاصد متعین کے گئے ہیں ، کیفیت وہیئت متعین نہیں کی گئی ہے ، جیسے : ''تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ'' (النساء : ۲۹) یعنی تجارت اور علی ہذا القیاس تمام عقود فریقین کی رضا مندی سے منعقد ہوں گے ؛ لیکن اظہار رضا مندی کا طریقہ کیا ہوگا ؟ زبان سے اظہار رضا مندی ضروری ہوگا یا تحریر بھی کافی ہوگی ، فریقین کا ایک ہی مجلس میں ایجاب وقبول کرنا ضروری ہوگا یا ضروری نہیں ہوگا ؟ کیا موجودہ دور میں آن لائن ایجاب وقبول کا طریقہ معتبر ہوگا یا نہیں ؟ ان جزئیات کو واضح نہیں فرمایا گیا ، اسی طرح آپ ﷺ نے مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو آگے بیچنے سے منع فرمایا ہے ؛ لیکن قبضہ سے کیا مراد ہے ؟ اس کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ؛ اس لئے عبادات میں تو ظاہری ہیئت بھی مطلوب ہوتی ہے اور اس کے ضمن میں مقاصد بھی ، اور معاملات میں بھی اگرچہ شکل کی ایک اہمیت ہے ؛ لیکن مقاصد کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔

مگر یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے ؛ چنانچہ معاملات کے باب میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ شکل کو اہمیت دی جاتی ہے اور شکل میں تبدیلی کو اس بات کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ چیز حرام کے دائرے سے باہر نکل جائے ، جیسے مشہور واقعہ ہے کہ حضرت بلالؓ نے دو صاع معمولی کھجور کے بدلہ ایک صاع عمدہ کھجور خریدی تو آپ ﷺ نے اسے ربا قرار دیا اور فرمایا کہ اگر یہ دو صاع معمولی کھجور درہم کے بدلہ فروخت کی جائیں اور پھر اس سے ایک صاع

عمدہ کھجور خرید کرلی جائے تو یہ جائز صورت ہوگی، یہاں آپ ﷺ نے شکل کو اہمیت دی، مقصد یہی تھا کہ معمولی کھجور کی زیادہ مقدار کے بدلہ کم مقدار میں عمدہ کھجور حاصل کی جائے؛ لیکن شکل کے تبدیل ہوجانے کو آپ ﷺ نے اس کے جائز ہونے کے لئے کافی سمجھا؛ البتہ معاملات میں زیادہ تر مقصد کو ترجیح دی گئی، جیسا کہ اگر کوئی شخص والی کو ہدیہ کے نام سے کوئی رقم دے تو آپ ﷺ نے اس کو رشوت کے حکم میں رکھا؛ (١) حالاں کہ شکل کے اعتبار سے یہ ہدیہ تھا اور دینے والے نے خود اس کو ہدیہ قرار دیا تھا۔

فقہاء کے طرز اجتہاد میں بھی دونوں پہلوؤں کی رعایت ملتی ہے، بعض دفعہ حکم لگاتے ہوئے مقصد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے؛ اسی لئے فقہاء نے 'بیع عینہ' کو منع کیا، جو شکل کے اعتبار سے بیع ہے؛ لیکن مقصد کے اعتبار سے ربا نظر آتا ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے معاملات کے سلسلہ میں قاعدہ مقرر کردیا: ''**العبرة بالمقاصد والمعاني للالفاظ والمباني**'' دوسری طرف ابواب حیل میں جو مسائل آتے ہیں، ان کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حرام سے باہر نکلنے کا راستہ مہیا کرنے کی غرض سے فعل کی ظاہری شکل کے اعتبار سے حکم لگایا گیا ہے نہ کہ فاعل کے مقصد کے اعتبار سے، اور ارباب افتاء نے بہت سے حیل کو قبول کیا ہے۔

بیع وفاء کے مسئلہ میں غور کیا جائے تو اُصولی طور پر ان ہی دو جہتوں کی وجہ سے حکم میں اختلاف واقع ہوا ہے، بظاہر یہ ایک بیع ہے اور دوسری بیع کا وعدہ ہے، مشتری بائع سے خرید کرتا ہے، کچھ عرصہ تک اس سے استفادہ کرتا ہے، پھر اسے اسی بائع کے ہاتھ بیچ دیتا ہے؛ لہٰذا شکلاً بیع ہونے کی وجہ سے اسے جائز ہونا چاہئے؛ لیکن بحیثیت مجموعی اس کی تہہ میں جو بات چھپی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ بائع کو چوں کہ قرضِ حسنہ ملنے کی اُمید نہیں؛ اس لئے وہ مشتری کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے اور پھر بعد میں اسے واپس خرید کرلیتا ہے، اس طرح بائع کی چیز اس کی ملکیت میں باقی رہتی ہے اور طالب قرض کی ضرورت ثمن کی صورت میں پوری ہوجاتی ہے، نیز خریدار کو ایک مدت کے لئے بلا کرایہ مکان وغیرہ سے استفادہ کا موقع مل جاتا ہے، اور اسے بائع کی ضرورت پوری کرنے پر نفع حاصل ہوجاتا ہے، اگر بیع وشراء کی تعبیر سے قطع نظر کرلیا جائے تو اس کے ربا ہونے میں کوئی شبہ نہیں؛ کیوں کہ یہ '**کل قرض جر نفعاً فهو رباً**'' میں شامل ہے۔

اس اُصولی بحث کے بعد اب ہمیں اس مسئلہ میں فقہاء کے اجتہادات پر نظر ڈالنی چاہئے، بنیادی سوال یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس معاملہ کو رہن مانا جائے یا بیع؟ اس پس منظر میں تین باتیں قابل غور ہیں :

(١) اگر یہ رہن ہے تو کیا مالِ مرہون سے مرتہن کے لئے نفع اُٹھانا جائز ہے؟

---

(١) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ٢٢٠٢، باب اراد بیع تمر بتمر خیر منہ۔

(۲) اگر یہ رہن نہیں ہے تو کیا یہ بیع ہے؟ اور اس حیثیت سے مشتری کے لئے اس سے نفع اُٹھانے کی اجازت ہے؟ جس کو متاخرین کی اصطلاح میں 'بیع وفاء' کہا جاتا ہے۔

(۳) اگر کوئی شخص اپنا مکان کسی سے بیچ دے اور پھر اس کو کرایہ پر حاصل کرلے، جس کو 'بیع استغلال' کہتے ہیں تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

(۱) مالِ مرہون سے استفادہ

اگر ہم نصوص پر غور کریں تو مالِ مرہون سے استفادہ کے سلسلہ میں دو حدیثیں بظاہر متعارض محسوس ہوتی ہیں، اول یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کل قرض جر نفعاً فھو ربا''۔(۱)

دوسری طرف آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

الظهر يركب بنفقته إذا كان مرهوناً، ولبن الدر يشرب بنفقته إذا كان مرهونا ـ (۲)

احادیث میں اختلاف کی وجہ سے فقہاء کے درمیان بھی اس مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

حنفیہ

احناف کے نقطۂ نظر کو بیان کرتے ہوئے عمدۃ المتاخرین علامہ شامیؒ فرماتے ہیں :

(لا انتفاع به مطلقاً) لا باستخدام ، ولا سكنى ، ولا لبس ، ولا إجارة ولا إعارة ، سواء كان من مرتهن أو راهنٍ (إلا بإذن) كل للآخر ، وقيل : لا يحل للمرتهن لأنه رباً ، وقيل : إن شرطه كان رباً و إلا لا ، وفي الأشباه والجواهر : أباح الراهن للمرتهن أكل الثمار أو سكنى الدار أو لبن الشاة المرهونة فأكلها لم يضمن وله منعه ، ثم أفاد فى الأشباه أنه يكره للمرتهن الانتفاع بذلك ـ (۳)

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہی بات فقہ حنفی کی مختلف کتابوں میں دہرائی گئی ہے۔(۴)

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی: ۵/۵۷۱۔ (۲) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۵۱۱، باب الرہن مرکوب ومحلوب۔

(۳) ردالمحتار علی الدر: ۵/۳۱۰، کتاب الرہن ط: احیاء التراث العربی۔

(۴) جیسے دیکھئے: تکملۃ الطوری علی البحر الرائق: ۸/۲۷۱۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(۱) نہ راہن کے لئے مالِ مرہون سے استفادہ جائز ہے اور نہ مرتہن کے لئے۔

(۲) راہن کی اجازت سے مرتہن اور مرتہن کی اجازت سے راہن استفادہ کرسکتا ہے۔

(۳) ایک قول یہ ہے کہ راہن کی اجازت سے بھی مرتہن استفادہ نہیں کرسکتا؛ اس لئے کہ یہ ربا ہے۔

(۴) اگر معاملہ طے پاتے وقت مرتہن نے اس سے مستفید ہونے کی شرط لگادی تھی تو یہ صورت ربا کی ہوگی اور جائز نہیں ہوگی؛ ورنہ جائز ہوگی۔

(۵) بعض مشائخ کے قول کے مطابق راہن کی اجازت سے مرتہن کو نفع اُٹھانے کی اجازت ہوگی؛ لیکن اس کے لئے ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔

البتہ علامہ شامیؒ نے اس پس منظر میں کہ ''شرط لگائی جائے تب ممانعت ہے ورنہ نہیں'' یہ اہم نکتہ اُٹھایا ہے کہ اگر کسی چیز کی بطور شرط صراحت نہ ہو؛ لیکن اسی کا عرف ورواج ہو تو یہ بھی شرط کے درجہ میں ہوتا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> قلت والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع ، ولو لاه لما أعطاه الدراهم ، وهذا بمنزلة الشرط ؛ لأن المعروف كالمشروط ، وهو مما يعين المنع ، والله تعالىٰ أعلم ۔ (۱)

مالکیہ

مالکیہ کا نقطۂ نظر علامہ ابن جزیؒ نے اس طرح نقل کیا ہے :

> المنفعة فى الرهن وهى المراهين فإذا اشترطها المرتهن جاز إن كان الدين من بيع أو شبهة ، ولم يجز إن كان سلفاً ؛ لإنه سلف جر منفعة ، فإن لم يشترطها المرتهن ثم تطوع له الراهن بها لم يجز ؛ لأنها هدية مديان ، وقال ابن حنبل : ينتفع المرتهن بالحيوان بنفقته ۔ (۲)

مالکیہ کے مسلک کا خلاصہ ''موسوعہ فقہیہ'' میں نقل کیا گیا ہے کہ مرتہن کا مال مرہون سے استفادہ کرنا جائز ہے؛ بشرطیکہ :

---

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار: ۵/۳۱۰ کتاب الرھن۔

(۲) القوانین الفقہیہ: ۱/۲۷۷، ط: دارالفکر، بیروت۔

۱- أن يشترط ذلک فی صلب العقد ـ
۲- وأن تکون المدة معينة ـ
۳- ألا يکون المرهون به دين قرض ـ
فإن لم يشرط فی العقد وأباح له الراهن الانتفاع به مجاناً لم يجز ؛ لأنه هدية مديان ، وهی غير جائزة ، وکذا إن شرّط مطلقاً ولم يعين مدة للجهالة ، أو کان المرهون به دين قرض ؛ لأنه سلف جر نفعاً ـ (۱)

شوافع

شوافع کے نزدیک مرتہن مالِ مرہون سے استفادہ نہیں کرسکتا :

ليس للمرتهن فی المرهون إلا حق الاستيثاق فيمنع من کل تصرف أو انتفاع بالعين المرهونة ـ (۲)

حنابلہ

حنابلہ کے نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ مرتہن راہن کی اجازت سے مالِ مرہون سے استفادہ کرسکتا ہے، یہ اجازت کی شرط دُودھ دُوہے جانے والے جانور اور سواری میں استعمال ہونے والے جانور کے علاوہ میں ہے، جو جانور دُودھ دیتا ہو یا اس کی سواری کی جاتی ہو، راہن سے اجازت لئے بغیر بھی مرتہن اس سے استفادہ کرسکتا ہے؛ بشرطیکہ وہ اس کے چارہ کا انتظام کرے؛ چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں :

الحال الثاني : ما يحتاج فيه إلی مؤنة ، فحکم المرتهن فی الانتفاع به بعوض أو بغير عوض ، بإذن الراهن ، کالقسم الذی قبله ، و إن أذن له فی الإنفاق والانتفاع بقدره جاز ؛ لأنه نوع معاوضة ، وأما مع عدم الإذن ، فإن الرهن ينقسم قسمين ؛ محلوباً ومرکوباً وغيرهما ، فأما المحلوب والمرکوب ، فللمرتهن أن ينفق عليه ، ويرکب ، ويحلب ، بقدرِ نفقته ، متحرياً للعدل فی ذلک ـ (۳)

---

(۱) الموسوعة الفقهية: ۲۳/ ۱۸۴ـ (۲) الموسوعة الفقهية: ۲۳/ ۱۸۴ـ

(۳) المغني مع الشرح الکبير: ۴/ ۲۸۹، کتاب الرهن، فصل الانتفاع بالرهن الذي يحتاج الی مؤنة ـ

امام احمدؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ایسے جانور سے بھی مرتہن راہن کی اجازت کے بغیر استفادہ نہیں کرسکتا؛ چاہے وہ اس کے چارہ کا انتظام کرتا ہو، یہ چارہ کا انتظام اس کی طرف سے تبرع سمجھا جائے گا۔(۱)

مذاہب اربعہ کا خلاصہ

(۱) راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن مالِ مرہون سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اس پر ایک صورت کے سوا مذاہب اربعہ کا اتفاق ہے، وہ ایک صورت یہ ہے کہ دُودھ دینے والا جانور ہو یا سواری کے لائق جانور ہوتو امام احمدؒ کے قولِ مشہور کے مطابق اگر مرتہن جانور کے چارہ کا انتظام کرتا ہوتو وہ راہن کی اجازت کے بغیر بھی مالِ مرہون سے استفادہ کرسکتا ہے۔

(۲) جمہور کے نزدیک راہن مرتہن کی اجازت سے مالِ مرہون سے استفادہ کرسکتا ہے، یہ رائے احناف، مالکیہ اور حنابلہ کی ہے؛ البتہ مالکیہ کے نزدیک مرتہن کا مالِ مرہون سے فائدہ اُٹھانا اسی وقت جائز ہوگا جب کہ معاملہ طے ہوتے وقت ہی یہ بات طے پا گئی ہو، اداءِ دین کی مدت متعین ہو اور یہ دین قرض نہ ہو۔

(۳) شوافع کے نزدیک مرتہن کسی بھی صورت میں مالِ مرہون سے استفادہ نہیں کرسکتا، حنفیہ کا ایک قول اس کے مطابق ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اگر دین میں مالِ مرہون سے استفادہ کی شرط لگادی گئی ہو، تب مرتہن کے لئے استفادہ کرنا جائز نہیں ہوگا، علامہ شامی نے صیغۂ تمریض ''قیل'' کے لفظ سے اس کا ذکر کیا ہے؛ لیکن اسی رائے کی طرف علماءِ سمرقند کا رجحان ہے، اسی کو جواہر الفتاویٰ میں ترجیح دی گئی ہے، اسی بنا پر بعض اہل علم نے تاویل کی ہے کہ دیانتاً جائز ہے، قضاءً مکروہ ہے، اس طرح حرام سے ایک درجہ کم ہوگیا؛ لیکن علامہ شامیؒ نے اپنے زمانہ کے عرف ورواج کو دیکھتے ہوئے اس کو مکمل طور پر منع کیا ہے۔

ان تمام آراء اور ان کے دلائل کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ مرتہن کے لئے مالِ مرہون سے استفادہ کرنا بلا اجازت تو ناجائز ہے ہی، اجازت بھی اگر شرط کے درجہ میں ہو اور مرتہن نے دین کے ساتھ استفادہ کی شرط عائد کردی ہو، خواہ عقد کے وقت یا عقد کے بعد یا عقد سے پہلے، تو یہ صورت جائز نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اس میں واضح طور پر قرض دے کر مقروض سے فائدہ اُٹھانے کی کیفیت پائی جاتی ہے؛ لہٰذا اگر یہ ربا نہ ہوتو شبہ ربا ضرور ہے، ہاں، اگر مرتہن کی طرف سے ایسی شرط نہ ہو اور نہ راہن سے اس کا مطالبہ ہو؛ لیکن راہن خود اجازت دے کہ مرتہن اس کی چیز سے استفادہ کرے تو اس کی گنجائش ہوگی اور عرف کی بنا پر اس کو منع نہیں کیا جائے گا؛

(۱) المغنی مع الشرح الکبیر: ۴/ ۲۸۹، کتاب الرہن، فصل الانتفاع بالرہن الذی یحتاج الی مؤنتہ۔

کیوں کہ عرف یہ ہے کہ اگر مرتہن مالِ مرہون سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو معاملہ طے ہوتے وقت ہی مال مرہون سے مستفید ہونے کی شرط لگا دیتا ہے، تو جب اُس نے شرط نہیں لگائی اور نہ راہن پر کوئی دباؤ ڈالا اور راہن نے خود اپنی طرف سے اجازت دے دی، تو ''الصریح أقوی من الدلالۃ'' کے تحت یہ صورت ''المعروف کالمشروط'' کے دائرہ میں نہیں آئے گی۔

البتہ یہ حکم اس صورت میں ہوگا جب کہ مرتہن نے جس چیز کو حاصل کیا ہو، وہ عین نہیں ہو؛ بلکہ عین سے وابستہ منفعت ہو، جیسے : مکان میں رہائش، سواری پر سوار ہونا وغیرہ؛ لیکن مالِ مرہون سے حاصل ہونے والے عین سے مرتہن کو استفادہ کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، جیسے : کھیت مالِ مرہون ہو تو اس کے غلہ سے، اور جانور مالِ مرہون ہو تو اس سے پیدا ہونے والے بچہ کی ملکیت حاصل کر کے؛ کیوں کہ منفعت کے مال ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہے؛ لیکن اعیان کے مال ہونے میں کوئی اختلاف نہیں تو اگر زمین کی پیداوار کو مرتہن لے لے تو یہ واضح طور پر قرض کے معاملہ میں مقروض سے زائد مال حاصل کرنا ہے، واللہ اعلم۔

(۲) مالِ مرہون کا کم کرایہ

مال مرہون سے مرتہن کے فائدہ اُٹھانے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ معمولی کرایہ ادا کرے، جن فقہاء کے نزدیک مرتہن کے لئے راہن کی اجازت سے مال مرہون سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے، ان کے نزدیک تو یہ مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوگا، وہ تو کم کرایہ کیا بلا کرایہ بھی رہن کے مکان میں رہنے کی اجازت دیں گے؛ لیکن جن فقہاء کے نزدیک راہن کی اجازت سے بھی مال مرہون سے مرتہن کا فائدہ اُٹھانا جائز نہیں ہے، ان کے نزدیک سوال پیدا ہوگا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ راہن بہت ہی معمولی کرایہ پر مال مرہون کو کرایہ پر لے لے؟

اس سلسلے میں بہ ظاہر دو اُصول متعارض ہیں، ایک یہ کہ فریقین کی رضامندی سے مالک مکان اپنی شئے کا جو بھی کرایہ چاہے مقرر کرسکتا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ عام طور پر جو کرایہ ہوتا ہو، وہی کرایہ متعین کرے، اس لحاظ سے اس کو جائز ہونا چاہئے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کا کم کرایہ ادا کرنا قرض کی وجہ سے ہے، گویا یہ قرض سے فائدہ اُٹھانے کی ایک شکل ہے، اس کا تقاضا ہے کہ یہ جائز نہیں ہو اور اُجرت مثل واجب ہو۔

اس کے لئے جواز کا ایک حیلہ یہ ہوسکتا ہے کہ قرض کو کرایہ کی مقدار کے ساتھ مربوط نہ کیا جائے، قرض کا لین دین پہلے ہو جائے، پھر کرایہ متعین کیا جائے؛ تاکہ دو معاملات کا ایک ساتھ اجتماع نہ ہو اور صفقۃ فی صفقۃ کی نوبت نہیں آئے، نیز قرض پر نفع حاصل کرنے میں اس کا شمار نہ ہو؛ چنانچہ اسی طرح کے ایک معاملہ کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے جواب دیا ہے :

یہ معاملہ شرعاً کرایہ اور ٹھیکہ ہے، مگر حیلہ کی صورت ہے؛ اس لئے بوقت ضرورت ایسی صورت پر عمل کرنا شرعاً درست ہے۔(۱)

لیکن غور کیا جائے تو یہ حیلہ سود حاصل کرنے کا حیلہ ہے، اور واضح طور پر قرض پر نفع حاصل کرنے کی ایک شکل ہے، اس لئے اس کو جائز نہیں ہونا چاہئے، فقہاء نے بھی ایسے مواقع پر اُجرت مثل واجب قرار دی ہے، علامہ شامیؒ نے فتاویٰ قاضی خان کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

> رجل استقرض دراهم و أسكن المقرض في داره قالوا : يجب أجر المثل على المقروض ؛ لأن المستقرض إنما أسكنه في داره عوضاً عن منفعة القرض لا مجاناً ، وكذا لو أخذ المقرض من المستقرض حماراً ليستعمله إلى أن يرد عليه الدراهم الخ وهذه كثيرة الوقوع ـ (۲)

البتہ اُجرت مثل سے ایک متعین قیمت مراد نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ بازار میں ایک سامان یا مکان کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ جو اُجرت ہوسکتی ہے، وہ سب اُجرت مثل میں شامل ہے؛ لہٰذا اگر راہن مکان مرہون کو کم سے کم مروجہ اُجرت میں حاصل کرے تو اس کی گنجائش ہوگی، برائے نام کرایہ متعین کرنا جائز نہیں ہوگا۔

چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے بائیسویں فقہی سیمینار منعقدہ امروہہ ۲۰۱۳ء میں اس سلسلے میں جو تجویز منظور کی ہے، وہ حسبِ ذیل ہے :

> قرض کی بناپر کرایہ میں مروجہ اُجرت کے مقابلہ غیر معمولی کمی (غبن فاحش) ''کل قرض جر نفعاً فهو حرام'' کے تحت ناجائز ہے۔

یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا جب کہ ہیوی ڈپازٹ لیا جائے اور معمولی کرایہ رکھا جائے؛ کیوں کہ آج کل مکان اور دُکان کے مالکان جو کثیر زرضمانت حاصل کرتے ہیں، کہتے تو ہیں اسے زرضمانت؛ لیکن اس کے ساتھ امانت کے تقاضے پورے نہیں کئے جاتے؛ بلکہ مکان یا دُکان کے مالکان اس رقم کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں؛ لہٰذا عملاً یہ قرض ہی کے حکم میں ہے، اور اگر مروجہ کرایہ کے مقابلہ میں کم کرایہ ادا کیا جائے تو یہ قرض پر فائدہ اُٹھانے میں

(۱) فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۲۶۷۔

(۲) ردالمحتار، کتاب الاجارۃ، مطلب: أسکن المقروض فی دارہ یجب اجر المثل قبیل باب ضمان الاجیر:۹/۸۷۔

شامل ہے، جو جائز نہیں ہے؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بائیسویں فقہی سیمینار منعقدہ ۲۰۱۳ء امروہہ میں علماء نے جو اجتماعی فیصلے کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے :

کسی بھی جائیداد، دُکان ومکان کو کرایہ پر لین دین کے لئے ضمانت کے نام سے لی جانے والی رقم شرعاً قرض کے حکم میں ہے۔

(۳) بیع وفاء

مجلۃ الاحکام العدلیہ مرتبہ خلافت عثمانیہ میں بیع الوفاء کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے :

بیع الوفاء هو البیع بشرط أن البائع متی رد الثمن یرد المشتري إلیه المبیع ، وهو فی حکم البیع الجائز بالنظر إلی انتفاع المشتري به ، وفی حکم البیع الفاسد بالنظر إلی کون کل من الفریقین مقتدراً علی الفسخ ، وفی حکم الرهن بالنظر إلی أن المشتري لا یقدر علی بیعه ۔ (۱)

عقد کی اس خاص صورت کو فقہاء نے مختلف ناموں سے تعبیر کیا ہے، اگر چہ عام طور پر حنفیہ اس کو بیع وفاء، مالکیہ بیع ثنیا اور شوافع بیع العہدہ یا رہن معاد اور حنابلہ بیع امانت سے تعبیر کرتے ہیں؛ لیکن اس کے علاوہ بیع الطاعۃ ، الرہن الحیازی اور بعض دوسرے ناموں سے بھی اہل علم نے اس کا ذکر کیا ہے اور ہر نام میں عقد کی نوعیت سے معنوی مناسبت قائم ہے۔

بیع الوفاء کے سلسلہ میں چند باتیں قابل توجہ ہیں :

(۱) بیع وفاء کے طور پر جو عقد کیا جائے وہ صحیح اور معتبر ہوگا یا یہ عقد فاسد ہوگا؟

(الف) اگر یہ بیع درست ہے تو بائع کی طرف سے یہ شرط کہ یہ چیز اسی سے فروخت کی جائے، خریدار پر لازم ہوگی یا نہیں؟

(ب) اگر مشتری پر اس شرط کی رعایت لازم ہے تو اس نے جس قیمت میں خرید کیا تھا، اُسی قیمت میں بائع کو واپس لوٹانا ضروری ہوگا یا وہ اس سے زائد کا بھی مطالبہ کرسکتا ہے؟

(۲) اگر یہ صورت رہن کی ہے تو دو سوالات پیدا ہوتے ہیں :

(الف) جب تک مدیون اسے واپس حاصل نہ کرلے، دائن کے لئے اس سے استفادہ کا کیا حکم ہوگا؟

---

(۱) مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ: ۱۱۸۔

(ب) اگر مالِ مرہون مکان کی صورت میں ہو اور دائن اس کا کرایہ ادا کرکے اس میں رہائش اختیار کرے؛ لیکن یہ کرایہ اُجرت مثل سے کم ہو تو کیا یہ بات درست ہوگی؟

جہاں تک بیع وفاء کی بات ہے تو مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے؛ چنانچہ زرقانی علی مختصر خلیل میں ہے :

شرط الثنيا يفسد البيع ولو أسقط ، ويعبر عنها في مصر بالبيع المعاد ـ (۱)

حاشیہ دسوقی میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ راجح قول کے مطابق یہ بیع ممنوع ہے؛ لہٰذا اگر بیع کے وقت یا عقد سے پہلے دونوں اتفاق کرلیں کہ بائع ثمن واپس کردے گا تو مشتری سامان لوٹادے گا تو بیع فاسد ہوجائے گی، اگرچہ بعد میں شرط کو ساقط کردے، تاہم اگر خریدار مبیع پر قبضہ کرلے اور واپس کرنے سے قبل اس سے آمدنی حاصل کرلے تو آمدنی اسی کی ہوگی، یہی راجح ہے؛ اس لئے کہ وہی اس چیز کا ضامن ہے؛ البتہ اگر خریدار بیع کے بعد بطور تبرع بائع سے وعدہ کرلے اور بیع کے لازم ہونے کے بعد اس سے کہے کہ جب تم مجھے ثمن واپس کروگے تو میں مبیع تم کو دے دوں گا، تو بیع صحیح ہوجائے گی؛ لیکن اس وعدہ کو پورا کرنا خریدار پر لازم نہیں ہوگا، مستحب ہوگا۔ (۲)

گویا مالکیہ کے نزدیک ہوگی تو یہ بیع فاسد؛ لیکن اگر خریدار کا اس پر قبضہ ہوجائے تو اس کا نفع اسی کے لئے ہوگا؛ کیوں کہ اب وہ اس کا ضامن ہے؛ لہٰذا ''الخراج بالضمان'' کے تحت وہ اس کا حقدار ہے؛ البتہ اگر عقد کے وقت واپسی کی بات طے نہیں کی جائے اور بیع لازم ہوجائے پھر خریدار بطور بر و احسان کے بائع سے وعدہ کرے کہ جب تم مجھے ثمن واپس کروگے تو میں دوبارہ تمہارے ہاتھ فروخت کردوں گا، تو اب اس وعدہ سے بیع کو نقصان نہیں پہنچے گا، بیع درست رہے گی؛ البتہ اس وعدہ کا پورا کرنا اس کے لئے مستحب ہوگا نہ کہ واجب۔

فقہاء شوافع عام طور پر اس کو 'بیع العہدۃ' سے تعبیر کرتے ہیں، اگرچہ شوافع کے یہاں اس بیع کے جواز اور عدم جواز میں اختلاف ہے؛ لیکن راجح یہی ہے کہ اگر صلب عقد میں واپسی کی شرط لگادی گئی تو شرط فاسد کی وجہ سے بیع فاسد ہوجائے گی، اور اگر فریقین نے اپنے دل میں یہ بات رکھی؛ لیکن صلب عقد میں زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا تو بیع درست ہوجائے گی :

---

(۱) شرح الزرقانی علی مختصر خلیل: ۵/۵۶، باب فی البیع، فصل علّۃ طعام الربا۔ (۲) دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر: ۱۱/۲۹۹-۳۰۰، حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر: ۶/۳۶۷، بلغۃ السالک لأقرب المسالک: ۳/۶۵۔

بلغني عن بعض علماء اليمن أنه أفتى بصحة بيع العهدة ، وبعضهم أفتى ببطلانه ، واختلافهم عجيب ، فإن القول بالصحة عند اقتران الشرط المفاسد بالعقد وبعدمها عند إضماره قول ساقط لا يعول عليه ولا يلتفت إليه ؛ بل المنقول فى مذهب الشافعي رضى الله عنه من غير خلاف يعتد به فى ذلك هو ما قررته فاعتمده ولا تغتر بما سواه والله سبحانه وتعالىٰ اعلم ۔ (۱)

فقہاء حنابلہ کی کتابوں میں بیع کی یہ صورت 'بیع امانت' کے نام سے معروف ہے، وہ بھی اس معاملہ کو باطل قرار دیتے ہیں :

قال الشيخ : بيع الأمانة هو الذى مضمونة اتفاقهما أى اتفاق البائع والمشترى على أن البائع جاء بالثمن أعاد إليه المشترى ملک ذلک ، ينتفع به أى بالمبيع المشترى بالإجارة والسكنى ونحو ذلک کرکوب مايركبه وحلبه ، وهو أى البيع إذن عقد باطل بكل حال ، و مقصودهما إنما هو الربا بإعطاء دراهم إلى أجل ومنفعة الدار أو نحوهما هى الربح فهو فى المعنى قرض بعوض ۔ (۲)

غرض کہ مالکیہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بنیادی طور پر بیع وفاء جائز نہیں ہے؛ چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں مذاہب اربعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے :

مذهب المالكية و الحنابلة و المتقدمين من الحنفية والشافعية إذا رد الثمن إلى المشترى يخالف مقتضى البيع ، وأيضا يقصد من ورائه الوصول إلى الربا المحرم ، وهو إعطاء المال إلى أجل ، ومنفعة المبيع هى الربح ، والربا باطل فى جميع حاله ۔ (۳)

(۱) الفتاویٰ الفقہیہ الکبریٰ: ۲/۱۵۷ باب البیع۔

(۲) کشاف القناع: ۸/۴۰۵، کتاب البیع، نیز دیکھئے: مطالب اولی النہی: ۷/۲۸۶، کتاب البیع، الاقناع: ۲/۵۸، شروط البیع۔

(۳) موسوعۃ الفقہیۃ، مادہ: بیع الوفاء۔

بیع وفاء کے حکم کے سلسلہ میں خود مشائخ احناف کے درمیان بھی خاصا اختلاف پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ صاحبِ فتاویٰ بزازیہ کے بیان کے مطابق اس سلسلہ میں ۹/اقوال ہیں، انھوں نے ان تمام اقوال کو نمبروار ذکر کیا ہے؛(۱) لیکن بنیادی طور پر اس سلسلہ میں ۳/نقاطِ نظر پائے جاتے ہیں :

(الف) یہ عقد فاسد ہے؛ کیوں کہ یہ معاملہ بیع کے نام سے کیا جاتا ہے اور اس میں یہ شرط کہ خریدار اس کو کسی اور سے فروخت نہیں کرے گا؛ بلکہ بائع کو پہلی ہی قیمت میں واپس فروخت کرے گا، تقاضۂ عقد کے خلاف شرط ہے اور شرط فاسد سے بیع فاسد ہوجایا کرتی ہے؛ چنانچہ صاحبِ فتاویٰ سراجیہ فرماتے ہیں :

بيع المعاملة وبيع الوفاء واحد ، و إنه بيع فاسد ؛ لأنه لا يقتضيه العقد ، وأنه يفيد الملک عند اتصال القبض به ، كسائر البيوع الفاسدة ـ (۲)

اسی طرح علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں :

الثالث : ما اختاره قاضی خان وقال : الصحيح إن وقع بلفظ البيع لا يكون رهنا ، ثم إن شرطا فسخه فی العقد أو تلفظا بلفظ البيع بشرط الوفاء ، أو تلفظا بالبيع وعندهما هذا البيع غير لازم ، فالبيع فاسد ، و إن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطاه على وجه المواعدة جاز البيع ولزم البيع ، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا ـ (۳)

اس نقطۂ نظر کی دلیل بالکل واضح ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع کے معاملہ میں شرط لگانے سے منع فرمایا ہے :

نهی رسول الله صلی الله عليه وسلم : عن بيع و شرط ـ (۴)

اس رائے کے مطابق اگر دو افراد مل کر اس طرح کا عقد کرلیں تو وہ بے اثر ہوگا، اس پر بیع صحیح کا حکم جاری نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس کے ساتھ شرط فاسد لگائی گئی ہے، اور رہن اس لئے نہیں ہوگا کہ رہن کے معاملہ کے لئے جو صیغہ مطلوب ہے، وہ صیغہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

---

(۱) دیکھئے: بزازیہ: ۴/۴۰۸۔
(۲) فتاویٰ سراجیہ علی ہامش فتاویٰ قاضی خان: ۳/۱۶۲۔
(۳) البحر الرائق: ۶/۱۲، باب خیار الشرط۔
(۴) رواه الطبرانی فی المعجم الوسیط، نصب الرایة: ۴/۱۷۔

(ب) دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ رہن کے حکم میں ہے؛ کیوں کہ معاملات میں اصل اعتبار مقاصد کا ہے نہ کہ الفاظ کا :

إن العبرة فی العقود بالمقاصد والمعاني ، لا للألفاظ والمباني ۔ (۱)

اسی لئے مختلف فقہاء نے تصریح کی ہے کہ بیع وفاء کے نام سے جو عقد معروف ہے، وہ دراصل رہن ہے، اور اس پر رہن ہی کے احکام جاری ہوں گے، علامہ شامی فتاویٰ خیریہ اور بعض دیگر اہل علم سے نقل کرتے ہیں :

قال فی الخیریة : والذی علیه الأکثر أنه رهن ، لا یفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام ، قال السید : قلت للإمام الحسن الماتریدی : قد فشا هذا البیع بین الناس ، وفیه مفسدة عظیمة ، وفتواک أنه رهن ، وأنا أیضاً علی ذلک ، والصواب أن نجمع الائمة ونتفق علی هذا ونظهر بین الناس ، فقال : المعتبر الیوم فتوانا ، وقد ظهر ذلک بین الناس ، فمن خالفنا فلیبرز نفسه ولیقم دلیله ۔ (۲)

علامہ شامیؒ نہ صرف اس کے ناقل ہیں؛ بلکہ خود بھی یہی رجحان رکھتے ہیں؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

البیع الذی تعارفه أهل زماننا احتیالا للربا ، وسموه بالوفاء ، هو رهن فی الحقیقة لا یملکه ولا ینتفع به إلا بإذن مالکه ، وهو ضامن لما أکل من ثمره ، وأتلف من شجره ویسقط الدین بهلاکه ، لا فرق عندنا بینه وبین الرهن فی حکم من الأحکام ۔ (۳)

اگر اس معاملے کو رہن مانا جائے تو یہ معاملہ قرض اور رہن کا ہوگا، راہن جس نے پیسے لیئے ہیں مدیون ہے، مرتہن جس نے پیسے دیئے ہیں دائن ہے، اور جو سامان رہن کے طور پر رکھا گیا ہے، وہ مال مرہون ہے، پس اس مال سے مرتہن کے استفادہ کرنے کا وہی حکم ہوگا، جو فقہاء نے مال مرہون کے استفادہ کے سلسلے میں لکھا ہے اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

---

(۱) شرح القواعد الفقہیہ، قاعدہ نمبر: ۵۵۔
(۲) شامی: ۲۴۶/۴ کتاب البیوع، باب الصرف۔
(۳) شامی: ۲۴۶/۴۔

جو حضرات اس کو رہن قرار دیتے ہیں، ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس عقد میں بائع کا اصل مقصد پیسے حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ سامان اس کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل بھی نہ جائے، جب وہ پیسہ واپس کرے سامان اسے واپس مل جائے، معاملہ رہن کا بھی خلاصہ یہی ہے کہ راہن مرتہن سے قرض حاصل کرتا ہے، اعتماد کے لئے کوئی شئ حوالہ کرتا ہے اور پھر پیسے ادا کر کے اپنی چیز واپس لے لیتا ہے تو مقصد کے اعتبار سے یہ رہن ہے اور معاملات میں مقصد کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے اور اس لئے جائز ہے، متاخرین احناف خاص کر مشائخ سمرقند، مشائخ بلخ، علامہ نجم الدین نسفی وغیرہ کا رجحان یہی ہے، فتاویٰ بزازیہ میں ہے :

اتفق مشائخ الزمان على صحة هذا البيع ؛ لأنها تلفظا بلفظ البيع ولا عبرة بمجرد النية بلا لفظ ؛ فإن من تزوج امرأة بنية أن يطلقها إذا مضى سنة لا يكون متعة ـ (۱)

اسی طرح علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں :

ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا لبعض أحكامه ، منهم نجم الدين نسفي ، فقال : اتفق مشائخنا فى هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزاً مفيدا لبعض أحكامه وهو الانتفاع به دون البعض ـ (۲)

خود علامہ زیلعیؒ کا فیصلہ بھی یہی ہے :

وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه ، والقواعد قد تترک بالتعامل وجوز الاستصناع لذلک ـ (۳)

علامہ ابن نجیم مصریؒ کے نزدیک بھی راجح یہی ہے کہ بحیثیت بیع یہ معاملہ جائز ہے :

الصحيح أنه إن وقع بلفظ البيع لا يكون رهناً و إن ذكر البيع بلا شرط ، ثم شرطاه على وجه المعاودة جاز البيع ولزم الوفاء ، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا ـ (۴)

(۱) فتاویٰ بزازیہ: ۱/ ۲۵۱، طبع جدید۔　(۲) تبیین الحقائق للزیلعی: ۶/ ۲۳، کتاب الاکراہ۔

(۳) تبیین الحقائق: ۶/ ۲۳ کتاب الاکراہ۔

(۴) البحر الرائق: ۶/ ۱۲، کتاب البیع، باب خیار الشرط، نیز دیکھئے: الفتاویٰ الہندیہ: ۳/ ۲۰۹۔

صاحب نہایہ کا بیان ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے :

قال صاحب النهاية : وعليه الفتوىٰ ۔ (۱)

جن حضرات نے ان کو جائز قرار دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ :

(الف) اس میں صراحتاً بیع کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور ایجاب وقبول کے ذریعہ معاملہ طے ہوتا ہے؛ لہٰذا اسے بیع مانا جائے گا؛ کیوں کہ: ''الصراحة أقوىٰ من الدلالة''۔

(ب) اس میں فریقین کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے کہ وہ بعد میں اسے بائع کے ہاتھ بیچ دے گا اور وعدہ کا پورا کرنا واجب ہے۔

(ج) اس پر لوگوں کا تعامل ہے اور تعامل بھی حجت ہے۔

(د) یہ عمل سود سے بچنے اور قرض حاصل کرنے کے لئے حاجت کا درجہ اختیار کر چکا ہے اور شریعت میں حاجت انسانی کا اعتبار ہے؛ چنانچہ مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے :

الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة ، ومن هذا القبيل تجويز بيع الوفاء ، حيث أنه لما كثرت الديون على أهل بخارى مست الضرورة إلى ذٰلک وصار مرعيا ۔ (۲)

خود برصغیر کے علماء کے درمیان بھی اس مسئلہ میں ایک گونہ اختلاف ہے، حلقۂ دیوبند کے سب سے بڑے فقیہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کو اصلاً ناجائز اور ضرورت شدیدہ کے وقت جائز قرار دیا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

رہن قصداً اور بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں، سو اصل قواعد مذاہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے، اور انتفاع اس سے حرام ہے، اور اگر وہ بیع ہے تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے، تب بھی حرام ہے؛ لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطرار شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطرار شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگر چہ مشتری کو کوئی اضطرار نہیں۔ (۳)

(۱) تبیین الحقائق: ۵/ ۱۸۳۔

(۲) مجلۃ الاحکام العدلیہ: ۱۹، المقدمۃ، المقالۃ الثانیۃ۔

(۳) امداد الفتاویٰ: ۳/ ۱۰۸، کتاب البیوع۔

حلقۂ دیوبند کے ایک اور بڑے فقیہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں :

بیع الوفاء مروجہ اگرچہ مختلف فیہ ہے؛ لیکن بروئے قواعد شرعیہ عدم جواز سے خالی نہیں۔(۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اسی طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

● یہ صورت بیع الوفاء کی ہے اور اس کے جواز عدم جواز میں اختلاف ہے، اور نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس طریق سے عقد کرنا بیع ہے یا رہن؟ اگر رہن ہے تو ظاہر ہے کہ بائع راہن ہوگا اور مشتری مرتہن، اور مرتہن کو شئ مرہونہ سے نفع حاصل کرنا علی الصحیح ناروا اور سود ہے: ''لأن کل قرض جر نفعاً فھو رباً''۔(۲)

● اور اگر بیع ہے جیسا کہ ظاہر ہے تو اس بیع میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ پندرہ سال کے اندر اگر بائع ثمن کو واپس کردے تو مشتری مبیع کو واپس کردے، اور یہ قاعدہ فقہیہ ہے کہ ایسی شرط سے بیع فاسد ہوجاتی ہے، پس بہر حال عقد مذکور شرعاً صحیح نہیں ہے اور مشتبہ ہونے میں تو اس کے کچھ شبہ ہی نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا ترک کرنا اس کا لازم ہے؛ کیوں کہ مشتبہات سے بچنا بھی مامور بہ ہے اور اتقاء شبہات موجب حفاظت دین ہے۔(۳)

ان تفصیلات کی روشنی میں اس حقیر کا خیال ہے کہ اگرچہ بہت سے اہل علم کے نزدیک بیع وفاء کی گنجائش ہے اور بالخصوص حنفیہ میں فقہاء متاخرین نے بکثرت اس نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے؛ لیکن راجح یہی ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، اور اگر عقد ہوگیا اور خریدار نے اس شئ پر قبضہ بھی کرلیا تو یہ رہن کے حکم میں ہے، خریدار کے لئے مبیع سے استفادہ جائز نہیں ہے اور نہ اس کو اس میں تصرف کا حق ہے؛ چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی الدولی (جدہ) نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے :

۱- إن حقیقة هذا البیع قرض جر نفعاً فهو تحایل علی الربا ولعدم صحته قال جمهور العلماء۔

۲- یری المجمع ان هذا لعقد غیر جائز شرعاً۔ (۴)

البتہ بہ وقت ضرورت یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ صلب عقد میں کوئی شرط نہیں لگائی جائے، عقد سے

(۱) فتاویٰ خلیلیہ: ۱/ ۳۹۵۔

(۲) فتح القدیر: ۶/ ۳۵۵، نیز دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبہ: ۴/ ۳۳۳، بیروت۔

(۳) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۴/ ۳۲۶۔

(۴) قرار مجمع الفقہ الاسلامی: ۶۶، بیع الوفاء۔

پہلے یا اس کے بعد مشتری اور بائع کے درمیان معاہدہ ہوجائے کہ مشتری بائع کو اسی قیمت میں وہ چیز واپس فروخت کردے گا؛ چنانچہ علامہ شامی جامع الفصولین کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں :

فی جامع الفصولین أیضاً : لو ذکر البیع بلا شرط ، ثم ذکر الشرط علی وجه العلة جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد ، إذ المواعید قد تکون لازمة فیجعل لازما لحاجة الناس ۔ (۱)

عام طور پر فقہاء نے یہ بات لکھی ہے کہ اگر معاملہ طے پا جائے اور طے پانے کے بعد فریقین میں معاہدہ ہو تو یہ معاہدہ درست ہوگا؛ بلکہ بعض فقہاء کے یہاں ایک درجہ میں صراحت ہے کہ عقد سے پہلے کے وعدہ میں اور عقد کے بعد کے وعدہ میں فرق ہے، اگر عقد سے پہلے فریقین کے درمیان عہد ہوگیا تو بیع اسی طرح فاسد ہوگی، جیسا کہ صلب عقد میں شرط لگانے سے فاسد ہوتی ہے؛ چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں :

ثم إن ذکر الفسخ فیه أو قبله أو زعماه غیر لازم کان بیعاً فاسداً ، ولو بعده علی وجه المیعاد جاز ، ولزم الوفاء به ؛ لأن المواعید قد تکون لازمة لحاجة الناس ۔ (۲)

لیکن معاملہ سے پہلے اور معاملہ کے بعد کے وعدہ میں فرق کئے جانے کی کوئی واضح وجہ سمجھ میں نہیں آتی؛ کیوں کہ اہمیت اس بات کی ہے کہ صلب عقد میں اگر شرط فاسد لگائی جائے تو اس سے بیع فاسد ہوجاتی ہے، اگر صلب عقد میں شرط نہیں لگائی جائے تو وہ شرط عقد سے مربوط نہیں سمجھی جائے گی اور اس لئے اس کی وجہ سے عقد فاسد نہیں ہوگا؛ لہٰذا خریدار کی طرف سے بائع کو واپس فروخت کرنے کا وعدہ اصل عقد میں نہ ہونا چاہئے، عقد سے پہلے یا عقد کے بعد وعدہ کیا جاسکتا ہے اور بحیثیت وعدہ اس پر وہی حکم جاری ہوگا، جو شریعت میں وعدہ پورا کرنے کا حکم ہے۔

آج کل اسلامک فائنانس کے اداروں میں عقد میں شرط فاسد کی قباحت سے بچنے اور صفقة فی صفقة سے معاملہ کو بچانے کے لئے ایسا ہی کیا جاتا ہے کہ اصل عقد سے الگ ایک فریق عہد نامہ کو پُر کرتا ہے اور اس عہد کو اس پر لازم سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ مرابحہ للآمر بالشراء، اجارہ منتہیہ بالتملیک اور شرکت متناقصہ وغیرہ میں کیا جاتا ہے۔

رہ گئی علامہ حصکفیؒ کی وہ بات جس کا ذکر اوپر آیا کہ اگر عقد سے پہلے دونوں کے درمیان وعدہ ہوا ہو تو یہ وعدہ عقد کا حصہ سمجھا جائے گا اور بیع فاسد ہوجائے گی تو یہ بات متفق علیہ نہیں ہے؛ چنانچہ ابن قاضی سماوہ فرماتے ہیں :

---

(۱) رد المحتار: ۷/۲۸۱، باب البیع الفاسد، مطلب فی الشرط الفاسد إذا ذکر بعد العقد أو قبلہ۔

(۲) الدر المختار بھامش رد المحتار: ۷/۵۴۶، کتاب البیوع، باب الصرف، مطلب فی بیع الوفاء۔

ولو تواضعا (أي التلجئة) قبل البيع ثم تبايعا بلا ذكر شرط ، جاز البيع عند أبي حنيفة إلا إذا تصادقا أنهما تبايعا على تلك المواضعة وكذا لو تواضعا الوفاء قبل البيع ، ثم عقد بلا شرط الوفاء فالعقد جائز ، ولا عبرة للمواضعة السابقة ۔ (۱)

فقہ المعاملات کے موجودہ دور کے سب سے بڑے عالم حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم کا رجحان اسی طرف نظر آتا ہے۔(۲)

اس لئے جواز اور عدم جواز کے دلائل ، اس عقد کی ظاہری شکل اور اس کا مقصد ، ممانعت ربا کی خصوصی اہمیت اور لوگوں کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اس حقیر کے نزدیک راجح یہ ہے کہ :

(الف) بیع وفاء (جس میں خریدار کی طرف سے مبیع کی واپسی کا تذکرہ صلب عقد ہی میں ہوتا ہے) جائز نہیں ہے اور اگر اس طرح معاملہ کرلیا گیا اور خریدار نے بائع کی اجازت سے مبیع پر قبضہ کرلیا تو یہ رہن کے حکم میں ہے۔

(ب) اگر کسی شخص کو قرض کی شدید ضرورت ہو اور کسی بنیادی ضرورت کی تکمیل اس سے متعلق ہو، نیز کوئی قرض حسنہ دینے والا نہیں ہو، کوئی ایسی زائد از ضرورت جائیداد بھی نہ ہو، جس کو فروخت کرکے وہ نقد پیسے حاصل کرلے، نیز جس چیز کو وہ بیع وفاء میں مبیع بنا رہا ہے، اس کی ملکیت سے دائمی طور پر اپنے آپ کو محروم کرلینا اس کے لئے نہایت ضرر کا باعث ہو، مثلاً یہ کہ اس کے پاس کوئی اور رہائشی مکان نہیں ہو، اور بیع وفاء میں اس کو جو قیمت حاصل ہو رہی ہے ، اس قیمت میں اس شہر میں اس طرح کا مکان حاصل نہیں ہوسکتا ہو، اگر وہ اس کو مکمل طور پر فروخت کردے تو ذاتی رہائشی مکان سے محروم ہوجائے گا، تو اس صورت میں اس کے لئے گنجائش ہے کہ وہ کسی کے ہاتھ اس مکان کو فروخت کرلے اور اصل معاملۂ عقد میں واپس خریداری کی شرط نہ لگائے ؛ البتہ الگ سے دونوں کے درمیان معاہدہ ہوجائے کہ جب بھی بائع کے پاس ثمن کی مقدار سرمایہ مہیا ہوجائے تو خریدار اسی قیمت میں موجودہ بائع کو فروخت کردے گا۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بائیسویں فقہی سیمینار منعقدہ: ۹-۱۱/ مارچ ۲۰۱۳ء امروہہ میں اس مسئلہ پر جو فیصلہ ہوا ہے، وہ اس طرح ہے :

---

(۱) جامع الفصولین: ۱/ ۲۳۷، فصل: ۱۸۔

(۲) دیکھئے: فقہ البیوع: ۱/ ۵۲۱۔

اگر کوئی شخص سخت ضرورت مند ہو، اس کو نہ قرض حسن ملے اور نہ ہی رہن پر قرض ملے، اور وہ نقد رقم حاصل کرنے کے لئے اپنی کوئی چیز کسی کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، جب کہ اس کا ارادہ ہو کہ بعد میں اس کو دوبارہ خرید لے گا تو اس کی گنجائش ہے؛ البتہ واپس خریداری کا ذکر اس معاملے کے کرنے کے درمیان نہ کیا جائے؛ بلکہ اس سے الگ باہمی معاہدہ ہو جائے کہ خریدار اسے اسی قیمت پر دوبارہ بائع کو فروخت کر دے گا تو ایسا کرنا درست ہوگا، اس صورت میں خریدار کے لئے مبیع سے نفع اُٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، تاہم اس سے احتیاط کرنا بہتر ہے۔

(۴) وعدہ کی حیثیت

اصل عقد سے پہلے یا اس کے بعد جو وعدہ کیا جائے، اس کا حکم وہی ہوگا، جو دوسرے مواعید اور معاہدات کا ہے؛ کیوں کہ :

(الف) اللہ تعالیٰ نے وعدہ پورا کرنے کا حکم دیا ہے: ''وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا''۔(۱)

(ب) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''العدۃ دین''۔(۲)

(ج) ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''**المؤمنون عند شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالاً**''۔(۳)

کسی شخص کا وعدہ کرنا کہ وہ دوسرے سے اتنی قیمت میں اس سے خرید کرے گا، ایک حلال و جائز چیز کا وعدہ ہے نہ کہ ناجائز و حرام کا اس لئے اس وعدہ کو پورا کرنا فریقین پر واجب ہوگا۔

اسی بنیاد پر فقہاء نے عمومی طور پر بھی وعدہ پورا کرنے کو دیانتاً یا قضاءً واجب قرار دیا ہے اور خاص اس معاملہ میں وعدہ پورا کرنے کو لازم قرار دیا گیا ہے :

● **كذا في فتاوىٰ قاضي خان : وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزم الوفاء بالوعد**۔ (۴)

---

(۱) الاسراء: ۳۴۔

(۲) الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث نمبر: ۵۶۶۴۔

(۳) جامع الصحیح للبخاری۔

(۴) الدر المختار: ۴۹۹، کتاب البیوع، باب الصرف۔

● وفی الدر المختار : ولو بعده علی وجه المیعاد جاز ولزم الوفاء ؛ لان المواعید قد تکون لازمة لحاجة الناس وھو الصحیح ، کما فی الکافی والخانیة ۔ (۱)

● وذکر الزیلعي : أن الفتوی علی أنه بیع مفید لبعض أحکامه من حل الانتفاع به ، إلا أنه لا یملک بیعه للغیر ۔ (۲)

لہٰذا خریدار کے لئے دونوں وعدوں کو پورا کرنا واجب ہے اور یہ بھی واجب ہے کہ جس قیمت پر اس کو خرید کیا تھا، اسی قیمت پر اسے واپس فروخت کرے، خریدار کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ اس سامان کو کسی اور سے بیچ دے، جیسا کہ ان فقہاء نے جو بیع بالوفاء کو جائز قرار دیتے ہیں، بیع وفاء کی مبیع کے بارے میں لکھا ہے :

باع کرمه من آخر بیع الوفاء وتقابضا ، ثم باعه المشتري من آخر بیعا تاما وسلم وعاب ، فللبائع أن یخاصم المشتري الثاني ویسترد منه الکرم ۔ (۳)

نیز ماضی قریب میں عالم اسلام کے سب سے بڑے فقیہ شیخ مصطفیٰ زرقاء بیع وفاء کے بارے میں فرماتے ہیں :

وفیه من معنی الرهن أن المشتري لا یملک حق استهلاک المبیع ولا نقل ملکیته إلی أحد بعوض ولا بغیر عوض ، ولا أن یرهنه ولا ینشئ علیه حقا عینیا لأحد ؛ بل یجب علیه حفظه وصیانته ، و إن المشتري ملزم برد المبیع بالوفاء إلی البائع متی رد هذا إلیه الثمن ، وهذا معنی الوفاء فی تسمیته ۔ (۴)

(۵) کیا اموالِ منقولہ میں بھی بیع وفاء ہے؟

جہاں تک یہ سوال ہے کہ بیع وفاء اموالِ غیر منقولہ ہی میں ہوسکتی ہے یا اموالِ منقولہ میں بھی ہوسکتی ہے؟ تو ظاہر ہے کہ یہ سوال ان ہی حضرات کے مذہب پر ہے، جن کے نزدیک بیع وفا ایک جائز معاملہ ہے، اس سلسلے میں علامہ حصکفیؒ نے نقل کیا ہے :

وفی الدرر صح بیع الوفاء فی العقار استحسانا ۔ (۵)

(۱) الہندیہ، کتاب البیوع، الباب العشرون: ۲۰۹/۳ ۔
(۲) البحر الرائق: ۱۲/۶ کتاب البیع، باب خیار الشرط ۔
(۳) الفتاویٰ الہندیہ: ۲۰۹/۳ کتاب البیوع، باب العشرون ۔
(۴) المدخل الفقہی العام: ۶۱۱/۱ ۔
(۵) درمختار مع رد المحتار: ۴۴۹/۹ کتاب البیوع، باب الصرف ۔

اس میں ''عقار'' کی قید ہے، اور کلامِ فقہاء میں مفہوم مخالف معتبر ہے، یہ حنفیہ کے یہاں معروف اُصول ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اموالِ منقولہ میں مجوزین کے نزدیک بھی بیع وفاء جائز نہیں ہے؛ چنانچہ علامہ حصکفیؒ کی اس عبارت پر علامہ شامیؒ نے جو وضاحتی نوٹ لکھا ہے، وہ اس طرح ہے :

واختلف فی المنقول ، قال فی البزازیة بعد کلام : ولهذا لم یصح بیع الوفاء فی المنقول ، وصح فی العقار باستحسان بعض المتأخرین ، ثم قال فی موضع آخر : وفی النوازل جوز الوفاء فی المنقول أیضاً اھـ ۔ (۱)

صاحب بزازیہ کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ ایک تو اس کی اجازت بطور استحسان کے دی گئی ہے، اور فقہاء متاخرین نے اس اجازت کو عقار تک محدود رکھا ہے اور جو حکم بطور استحسان کے ہوتا ہے، وہ خلافِ قیاس ہوتا ہے؛ اس لئے اس کو دوسری صورت تک متعدی نہیں ہونا چاہئے، دوسرے بیع وفاء کی جو بھی صورت ہو خواہ یہ صورت کہ صلب عقد میں ہی بائع کو دوبارہ واپس بیچنے کا معاملہ طے ہوجائے یا صلب عقد میں تو کوئی شرط نہیں ہو؛ لیکن عقد سے پہلے یا اس کے بعد آپس میں معاہدہ ہوجائے، ہر دوصورت میں مبیع بائع کو واپس فروخت کی جاتی ہے، پس اگر اموالِ منقولہ میں وعدۂ بیع ہو تو اس کا محفوظ رہنا ضروری نہیں اور اس طرح کا وعدہ کرنے میں غرر ہے، حنفیہ کے نزدیک اموالِ منقولہ میں بیع قبل القبض کے ناجائز کی یہی علت مانی گئی ہے؛ لہٰذا صحیح اور راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جن حضرات کے نزدیک بیع وفاء جائز ہے، ان کے نزدیک بھی یہ صرف اموالِ غیر منقولہ میں درست ہوگی نہ کہ اموالِ منقولہ میں بھی، واللہ اعلم ۔

لیکن جن حضرات کے نزدیک یہ معاملہ رہن کے حکم میں ہے جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے تو رہن چوں کہ اموالِ منقولہ کا بھی جائز ہے؛ اس لئے ان کے نزدیک بیع وفاء بمعنی رہن، اموالِ منقولہ میں بھی جائز ہوگا۔

(۶) بیع استغلال

یہ بیع وفاء ہی کی ایک شکل ہے؛ چنانچہ ''مجلۃ الاحکام'' میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

بیع الاستغلال هو بیع المال وفاء علی أن یستأجره البائع ۔ (۲)

---

(۱) الدر المختار مع الرد المحتار: ۷/ ۵۵۰ کتاب البیوع، باب الصرف ۔

(۲) مجلۃ الاحکام، دفعہ: ۱۱۹ ۔

چوں کہ یہ بیع وفاء ہی کی ایک صورت ہے جس میں بائع خریدار سے اپنی چیز بیچتا ہے اور پھر اسے کرایہ پر حاصل کرلیتا ہے، تو جن حضرات کے نزدیک بیع وفاء ایک درست عقد ہے اور اس کی وجہ سے خریدار کی مبیع پر ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، ان کے یہاں یہ صورت جائز ہوگی ؛ کیوں کہ مالک اپنی چیز میں جیسے دوسرے تصرفات کرسکتا ہے، اسی طرح کرایہ پر بھی لگا سکتا ہے؛ چنانچہ استاذ محاسنی نے شرح مجلہ میں لکھا ہے :

وهو بحكم البيع بالوفاء وأخص منه ويجوز إيجار المبيع للبائع ولغيره ـ

گذشتہ فقہاء کے یہاں بھی اس کا ذکر ملتا ہے :

فان أجر المبيع وفاء من البائع ، فمن جعله فاسداً قال : لا تصح الإجارة ولا يجب شيئ ، ومن جعله رهنا كذلك لم يلزم البائع الأجر ، ومن أجازه جوز الإجارة من البائع وغيره و أوجب الأجر ـ (۱)

البتہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ خریدار نے مبیع پر قبضہ کرلیا ہو، پھر اسے کرایہ پر لگا یا گیا ہو اور عقد اجارہ کے اُصول کے مطابق اجارہ کی مدت متعین کی گئی ہو، پھر اگر مدت اجارہ گذر جائے اور وہ چیز اس کے قبضہ میں باقی رہے تو علماء روم کے فتوے کے مطابق بائع (کرایہ دار) پر اُجرت مثل واجب ہوگی :

قلت : وفي فتاوى ابن الجلبي : إن صدرت الإجارة بعد قبض المشتري المبيع وفاء ولو للبناء وحده فهي صحيحة ، والأجرة لازمة ، للبائع طول مدة التأجر انتهى ، فتنبه ، قلت : وعليه فلو مضت المدة وبقي في يده فأفتى علماء الروم بلزوم المثل ويسمونه بيع الاستغلال ـ (۲)

لیکن راجح یہی ہے کہ یہ عقد رہن کے حکم میں ہے؛ اس لئے رہن کے اُصول کے مطابق 'مرتہن' سے کرایہ پر نہیں لگا سکتا؛ کیوں کہ یہ مالِ مرہون سے انتفاع ہے، جیسا کہ علامہ شرنبلالیؒ کے حوالہ سے علامہ حصکفیؒ نے نقل کیا ہے :

---

(۱) الفتاویٰ البزازیہ بہامش الہندیہ: ۴۱۲-۴۱۳، نیز دیکھئے: ردالمحتار: ۵۸۶/۱۵ ۔

(۲) الدرالمختار: ۴۴۹، کتاب البیوع، باب الصرف قبیل، کتاب الکفالۃ ۔

ولو استأجره بائعه لا يلزمه أجر ؛ لانه رهن حكماً حتى لا يحل الانتفاع به ـ (۱)

بلکہ بعض فقہاء کی صراحت کے مطابق اگر مرتہن نے اس کو کرایہ پر حاصل کرلیا تو عقد رہن ختم ہوجائے گا؛ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں :

قلت : و إذا أجره بإذنه يبطل الرهن كما ذكره في حاشيته على الفصولين ـ (۲)

نیز شیخ عبدالرحمٰن جزیریؒ فرماتے ہیں :

الحالة الثانية : أن يكون المستأجر هو المرتهن وجدد استلام المرهون بالإجارة أو يكون المستأجر أجنبياً عنهما بإذنهما ، وفي هذه الحالة يبطل عقد الرهن ، وتكون الأجرة للراهن ـ (۳)

البتہ بیع وفاء کی صورت کے متبادل کے طور پر جواز کی جو صورت لکھی گئی ہے کہ صلب عقد میں مبیع کی واپسی کی شرط نہ ہو اور الگ سے فریقین کے درمیان معاہدہ ہوجائے کہ وہ اس کی سابقہ قیمت پر ہی بائع کے ہاتھ بیچ دے گا تو اس صورت میں چوں کہ بیع منعقد ہوجاتی ہے اور مبیع پر خریدار کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے تو اس لئے جب بیع مکمل ہوجائے اور خریدار کا قبضہ ہوجائے پھر وہ بائع کو کرایہ پر دے دے تو اس کی گنجائش محسوس ہوتی ہے، اگرچہ کہ اموالِ غیر منقولہ میں تصرف کے لئے قبضہ ضروری نہیں ہے ؛ لیکن اس صورت میں بھی از راہ احتیاط قبضہ کی شرط ملحوظ ہوگی ؛ چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں :

و إن أجره من البائع قبل القبض ، أجاب صاحب الهداية أنه لا يصح ، واستدل بما لو أجر عبدا اشتراه قبل قبضه ، أنه لا تجب الأجرة ، وهذا في البات فما ظنك بالجائز ؟ الخ ، فعلم به أن الإجارة قبل التقابض لا تصح على قول من الأقوال الثلاثة ـ (۴)

● ● ●

(۱) الدر المختار: ۴۴۹، کتاب البیوع، باب الصرف، قبیل کتاب الکفالہ۔

(۲) شامی: ۷/۴۲۷، کتاب البیوع، باب الصرف ط: بیروت، لبنان۔

(۳) الفقہ علی المذاہب الاربعہ مکمل: ۵۸۳۔

(۴) رد المحتار: ۱۵/۵۸۶-۵/۲۷۸، کتاب البیوع، باب الصرف۔

مطالعہ کے اُصول وآداب

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

تمہید

علم کی بنیاد جہل کا احساس اور تحقیق وجستجو کا جذبہ ہے، آج دنیا میں جو بھی علوم ہیں، وہ اسی احساس نایافت اور تلاش وتحقیق کے جذبہ کی مرہون منت ہیں، علم جتنا بڑھتا جاتا ہے، جہالت کا احساس اسی قدر شدید ہوتا جاتا ہے، انسان کی معلومات جس قدر بڑھتی جاتی ہیں، یہ جذبہ قوی ہوتا جاتا ہے کہ ہم کتنا کچھ نہیں جانتے اور جو کچھ جانتے ہیں وہ کتنا کم ہے، اس حقیقت کا احساس متعدد علماء، فضلاء اور فلاسفہ نے کیا ہے کہ ''معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد'' کہ علم کی حقیقت جہل کا احساس ہی ہے، اس کے برعکس جن لوگوں کے اندر اپنی جہالت کا احساس نہیں ہوتا، وہ کبھی علم سے آشنا نہیں ہو پاتے، تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ انہی لوگوں نے اپنی علم وفضل سے دنیا کو روشن کیا ہے، جن کے اندر اپنی جہالت کا احساس تھا اور کچھ نیا جاننے کا جذبہ اور تلاش وجستجو کی لگن تھی۔

مطالعہ علم کی شاہ کلید ہے

مطالعہ چاہے کتابوں کا ہو، یا آفاق وانفس کا، وہ علم کے لئے شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے روح کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مطالعہ کے بغیر علم کا تصور نہیں کیا جا سکتا، کسی ادارے سے فراغت اور ڈگری کے حصول کے معنی محض یہ ہیں کہ اب وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ کتابوں کا وہ خود سے مطالعہ کر کے علم حاصل کر سکے، جس طرح ایک بچہ پہلے ماں باپ کی گود میں رہتا رہتا ہے، کچھ عرصہ بعد وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگتا ہے اور مزید کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ خود سے دوڑنے بھاگنے لگتا ہے، اسی طرح حرف شناسی کی صلاحیت اور علوم آلیہ وعالیہ یعنی وسائل اور مقصود کی کتابیں اساتذہ سے پڑھنے کے بعد اور متعلقہ فن کے مباحث اور اصطلاحات کو سمجھنے کے بعد آپ اس قابل ہو گئے ہیں کہ خود سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

مطالعہ کا اُصول

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کا ہر کام اُصول کی پابندی سے ہی ممکن ہوسکتا ہے، بغیر اُصول کی پابندی کے کوئی کام درست انداز میں انجام نہیں دیا جاسکتا، کھانا پکانے میں بھی اُصول کی پابندی نہ کی جائے اور جس چیز کو جتنا ڈالنا ہے اور جب ڈالنا ہے اس کی پابندی نہ کی جائے تو کھانا بدمزہ ہوجائے گا، انسان رات کے وقت جاگے اور دن کے وقت سوئے تو تھوڑے دنوں کے بعد اس کی صحت تباہ ہوجائے گی، حد سے زیادہ کام کرے یا آرام کرے تو بیمار پڑ جائے گا۔

ایسے ہی مطالعہ کے بھی کچھ اُصول اور ضوابط ہیں، جو ان کی پابندی کرتے ہیں وہ تھوڑی محنت سے بھی کامیاب ہوجاتے ہیں اور جو ان کی پابندی نہیں کرتے، وہ بہت زیادہ محنت کرنے کے باوجود اور کتابی کیڑا بننے کے باوجود ناکام رہتے ہیں، افسوس کی بات یہ ہے کہ بیشتر طلباء اور اہل علم جن کے دلوں میں علم کی شمع روشن ہے اور انھیں مطالعہ سے شغف بھی ہے، وہ بھی مطالعہ کے اُصول سے ناواقفیت کی وجہ سے زیادہ محنت کے باوجود کم فائدہ حاصل کرتے ہیں؛ حالاں کہ اگر مطالعہ صحیح طور پر کیا جائے تو کم وقت میں زیادہ فائدہ ہوگا، اور اس سے جہاں وقت میں برکت ہوگی وہیں جسمانی صلاحیتوں کا بہتر استعمال بھی ممکن ہوگا۔

علم کا احترام

انسان کو جس چیز سے فائدہ پہنچتا ہے، اس نفع اور فائدہ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا احترام کیا جائے، غیر مسلم برادران وطن ہر اس چیز کو پوجتے ہیں جس سے ان کو نفع ہوتا ہے، حتیٰ کہ سال میں ایک دن وہ اپنے کاروبار اور جس چیز کا کاروبار کررہے ہین اس کی پوجا کے لئے خاص کرتے ہیں، میں جب بنگلور کے ایک اخبار میں ملازمت کررہا تھا تو ایک دن اخبار کو مجبوراً چھٹی کرنی پڑتی تھی کیوں کہ اس دن جس پریس سے ہمارا اخبار چھپتا تھا، وہاں کے مالکان پریس کی پوجا کرتے تھے، اسی طرح ہندو گائے، دریا، سمندر، پہاڑ، درخت، اور پتہ پتہ نہیں کس کس چیز کی پوجا کرتے ہیں؛ لیکن ان سب کی تہہ میں یہی جذبہ ہے کہ جس سے نفع ہو، اس کا احترام کیا جائے، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اس فطری جذبہ کو غلو اور مبالغہ تک پہنچادیا اور جس کا محض احترام کرنا چاہئے اس کی عبادت کرنے لگے۔

نفع پہنچانے والی چیزوں کا احترام کرنے کی تعلیم اور تاکید اسلام نے بھی دی ہے؛ چنانچہ کھانے کو، پانی کو ضائع کرنے سے منع کیا گیا ہے، جانوروں پر ظلم وزیادتی اور ان کی طاقت سے زیادہ کام لینے سے منع کیا گیا ہے، ذبح کرنے میں تاکید کی گئی ہے کہ اچھی طرح ذبح کیا جائے، چاقو کند نہ ہو، جس سے جانور کو زیادہ تکلیف ہو۔

علم بذات خود بہت محترم ہے،مزید یہ کہ اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہے،علم کا احترام اس نسبت سے بھی ہونا چاہئے اور اس لئے بھی کہ یہ دنیا وآخرت میں ہماری کامیابی اور سعادت ونجات کا باعث ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام خود بھی علم کا بڑا احترام کرتے تھے اور علم سے منسوب تمام چیزوں کا احترام کرتے تھے، اور اس کی تاکید کرتے تھے، حصول علم میں احترام علم کو بہت زیادہ دخل ہے، جس کے اندر علم کا احترام جس قدر ہوگا، اللہ پاک اسی قدر اس کو علم سے نوازیں گے۔

علم کے احترام کے کئی تقاضے ہیں، پہلا اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ گناہوں سے بچا جائے؛ کیوں کہ علم خدا کا نور اور اس کا انعام وعطیہ ہے اور اس کا محل قلب ہے؛ لہٰذا دل کو گناہوں کی آلائش سے بچایا جائے اور خدا کی اس نعمت کو پاک وصاف برتن میں رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

دُودھ ایک لطیف غذا ہے، اس کو صاف برتن میں رکھا جاتا ہے، اگر برتن میں باسی کھانا ہے، کھانا خراب ہوکر کھٹا ہو چکا ہے، اس برتن کو اگر ٹھیک سے صاف نہ کیا جائے اور دُودھ رکھ دیا جائے تو دُودھ فوراً پھٹ جائے گا، دُودھ اچھے برتن میں ہے؛ لیکن اس میں کوئی ایک قطرہ لیموں کا رس ٹپکا دے تو بھی دُودھ فوراً پھٹ جائے گا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ لطیف اشیاء جہاں رکھی جاتی ہے اس کا بھی پاک وصاف ہونا ضروری ہے اور رکھنے کے بعد اس کی نگرانی بھی ضروری ہے کہ کہیں اس میں کچھ ایسی چیز نہ گر جائے جس کی وجہ سے وہ لطیف شئے خراب ہوجائے، علم کے حصول کے قبل بھی گناہوں سے بچا جائے اور علم کے حصول کے دوران بھی گناہوں سے بچنے کی کوشش جاری رہنی چاہئے۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ علم خدا کا نور ہے جس کو وہ اپنے بندوں کے دل میں ڈالتا ہے، رکھتا ہے :

إِنَّمَا الْعِلْمُ نُورٌ يَجْعَلُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي القلب ۔ (۱)

لہٰذا ضروری ہے علم کے محل اور مقام یعنی دل کو پاک وصاف رکھا جائے، معاصی وگناہ کی کثرت سے اس کو آلودہ اور سیاہ نہ کیا جائے، خدا کے نور کے لئے دنیا کا سب سے لطیف برتن چاہئے، اور دنیا کا سب سے لطیف برتن دل ہے، جو ایمان کا بھی محل اور مقام ہے، علم کے لئے دل کو پاک وصاف ہونا چاہئے؛ کیوں کہ خدا کا نور کسی گندے برتن میں نہیں آسکتا اور ہمیشہ نگرانی کی بھی ضرورت ہے کہ انسان گناہ نہ کرے، جس کی نحوست سے علم کا نور زائل ہوجائے، حدیث میں اور بزرگوں کے کلام میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے کہ اگر تم علم کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو، تو گناہوں سے پرہیز کرو :

عن يزيد بن سلمة الجعفي ، قال : قال يزيد بن سلمة :

(۱) الکامل فی ضعفاء الرجال: ۱/۱۰۰۔

يارسول الله ، إني قد سمعت منك حديثا كثيرا أخاف أن ينسيني أوله آخره ، فحدثني بكلمة تكون جماعا قال : ''اتق الله فيما تعلم'' ۔ (۱)

یزید بن سلمہ کہتے ہیں : میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا : میں نے آپ سے بہت سی حدیثیں سنی ہیں، مجھے خدشہ یہ ہے کہ کہیں میں اس کو بھول نہ جاؤں، آپ مجھے کوئی جامع بات بتا دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا، جو کچھ جانتے ہو اس میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

اس حدیث میں لطیف طرز سے گناہ اور ضعف حافظہ کا تعلق واضح کیا گیا ہے، صحابہ وتابعین نے بھی گناہوں کو ضعف حافظہ کا سبب بتایا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے ارشاد میں گناہوں کو یادداشت کی کمزور کا سبب بتایا ہے؛ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

انی لا حسب الرجل ینسی العلم بالخطیئة یعملها ۔ (۲)

میرا خیال یہ ہے کہ انسان گناہ کی شامت سے علم بھول جاتا ہے۔

امام وکیع مشہور محدث ہیں، انھوں نے بھی اسی قبیل کی بات کہی ہے :

سمعت علی بن خشرم ، يقول : شكوت إلى وكيع قلة الحفظ ، فقال : ''استعن على الحفظ بقلة الذنوب'' ۔

علی بن خشرم کہتے ہیں میں نے وکیع سے کمزور حافظہ کی شکایت کی تو انھوں نے فرمایا، یادداشت کی مضبوطی کے لئے گناہوں سے پرہیز کرو۔

علم کے احترام کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ علم سے وابستہ تمام چیزوں کی تکریم کی جائے، کاپی، کتاب قلم، دوات، اوران سب سے بڑھ کر اساتذہ کا حتی الامکان ادب واحترام کیا جائے اور کبھی بھی ان کے اکرام کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، علم سے منسوب اشیاء اور اساتذہ کا احترام یہ ظاہر کرتا ہے کہ طالب علم کے اندر علم کا کس کا قدر احترام ہے، اور جو انسان اساتذہ کا، علم سے وابستہ اشیاء کا احترام کرے گا، وہ خود نفس علم کا کس قدر احترام کرے گا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۸۳۔

(۲) جامع بیان العلم وفضلہ: ۱/ ۵۵۷۔

علامہ انور شاہ کشمیری کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، ان کے احترام علم کا ایک واقعہ نقل کرتا ہوں؛ تا کہ طلبہ کو پتہ چلے کہ علم کا احترام کسے کہتے ہیں: علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد مولانا حامد الانصاری غازی نقل کرتے ہیں :

> ایک مرتبہ علامہ انور شاہ کشمیری کورات کو دوران مطالعہ کئی مرتبہ استنجا کا تقاضا ہوا، ہر مرتبہ کتاب بند کی، کتاب کو الماری میں رکھا، استنجا کے لئے گئے، پھر وضو کیا اور پھر الماری سے کتاب لے کر مطالعہ شروع کیا، علم کا اس درجہ احترام کہ کتاب کو تپائی پر بھی خالی رکھنا گوارہ نہ کیا؛ بلکہ اس کو الماری میں رکھا اور اس کے بعد استنجا کے لئے گئے۔(۱)

خود علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک طالب علم سے حدیث کے مطالعہ کے تعلق سے اپنا طرز عمل بتاتے ہوئے فرمایا :

> حدیث کے لحاظ سے تم مجھے کیا دیکھتے ہو، حدیث کا مطالعہ کبھی لیٹ کر نہیں کرتا، ہمیشہ عمر بھر بیٹھ کر مطالعہ کیا ہے، تھک جاتا ہوں تو لیٹ جاتا ہوں تھکان اُتر جاتا ہے تو پھر بیٹھ جاتا ہوں اور مطالعہ کرتا ہوں، درس حدیث اور مطالعہ کے وقت باوضو رہتا ہوں، وضو کے بغیر نہ حدیث کا مطالعہ کرتا ہوں، نہ حدیث کے معانی اور مفاہیم پر غور۔(۲)

اللہ اکبر! غور کیجئے کہ بغیر وضو کے حدیث کے معانی اور مفاہیم پر غور وفکر تک نہیں کرتے تھے، یہ کس درجہ کا احترام حدیث ہے، کیا آج ہمارے اندر اس درجہ احترام ہے، اگر جواب نفی میں ہے تو پھر یہ شکوہ کیوں کہ ہمیں علامہ انور شاہ کشمیری جیسا حافظہ نصیب نہیں ہے؟ خود علامہ انور شاہ کشمیریؒ بھی اپنے قوت حفظ کو احترام حدیث کا ثمرہ قرار دیا کرتے تھے؛ چنانچہ ایک دوسرے موقعہ سے فرمایا :

> حافظہ کی قوت اسی احترام حدیث کا انعام ہے اور ایک تیسرے موقعہ سے فرمایا: جسے احترام کی توفیق ہے اس کے لئے انعام مقدر ہے۔(۳)
>
> علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے حدیث کے احترام کی حقیقت بھی واضح فرمائی؛ چنانچہ فرمایا :
>
> حدیث کے احترام کی اصل حقیقت حدیث پر عمل اور سنت کے مطابق زندگی ہے، بہت سے لوگ علم حدیث میں کمال رکھتے ہیں، فن حدیث اور شروحات حدیث پر تقریر کی صلاحیت رکھتے ہیں، مگر عمل میں کوتاہ ہیں، توفیق کے لئے احترام حدیث شرط ہے، احترام نہیں تو خواہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو جائے، کچھ نہیں۔(۴)

---

(۱) علامہ انور شاہ کشمیری: ۱۷۳۔
(۲) علامہ انور شاہ کشمیری: ۱۷۳۔
(۳) علامہ انور شاہ کشمیری: ۱۷۲۔
(۴) علامہ انور شاہ کشمیری: ۱۷۲۔

واضح رہے کہ بات صرف حدیث کی نہیں ہے؛ بلکہ انسان علم کی جس شاخ کو بھی حاصل کرنا چاہے، اس کے لئے علم کی اس شاخ کا ادب واحترام ضروری ہے، کشف الظنون کے محترم مصنف نے کتاب کی ابتداء مین حصول علم کے کچھ آداب اور رہنما اُصول بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بیان کیا ہے :

ومن الآداب : احترام المعلم ، و إجلاله ، فمن تأذى منه أستاذه ، يحرم بركة العلم ، ولا ينتفع به إلا قليلا ، وينبغي أن يقدم حق معلمه على حق أبويه ، وسائر المسلمين ، ومن توقيره : توقير أولاده ، ومتعلقاته ، ومن تعظيم العلم تعظيم الكتب ، والشركاء ۔ (۱)

علم کے آداب میں سے یہ ہے کہ استاد کا احترام اور اکرام کرے، جس طالب علم سے استاد آزردہ خاطر ہو، وہ علم کی برکت سے محروم رہتا ہے اور بہت کم فائدہ حاصل کر پاتا ہے، طالب علم کو چاہئے کہ استاد کا حق اپنے والدین اور سائر مسلمانوں سے مقدم جانے، اور استاذ کے ادب واحترام میں اس کی اولاد اور متعلقین کا ادب واحترام بھی شامل ہے، اور علم کی تعظیم میں کتاب اور درسی ساتھیوں کی تعظیم شامل ہے۔

علم کے احترام کا تیسرا تقاضا ہے کہ انسان حصول علم میں پیش آنے والی تکالیف پر صبر کرے اور ماضی کے علماء کی زندگی سے سبق حاصل کرے کہ انھوں نے علم کے لئے کس طرح اپنی جان کو گھلایا اور اس راہ میں ہر قسم کی سختیاں اور مصیبتیں برداشت کیں، حتی کہ بعض کو پیاس کے مارے اپنا پیشاب تک مجبوری میں پینا پڑا، بعض حضرات کو آنکھوں کی قربانی دینی پڑی، سردی کی شدت سے امام لغت وادب زمخشری کا پاؤں گل گیا، جس کی وجہ سے پاؤں کاٹنا پڑا؛ لیکن انھوں نے علم کی راہ سے منھ نہ موڑا اور ان ائمہ اعلام کا آج کے طالب علموں کے لئے بھی پیغام یہی ہے، امین عامر عثمانی نے کیا خوب کہا ہے :

میرے ساتھ ساتھ چلے وہی جو کہ خار راہ کو چوم لے
جسے کلفتوں سے گریز ہو ، وہ میرا شریک سفر نہ ہو

ان ائمہ اعلام کو حصول علم میں کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں تھیں اس کے لئے تذکرۃ الحفاظ، سیر اعلام النبلاء اور اُردو میں بالخصوص مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کی علماء سلف اور نابینا علماء کا مطالعہ کیا جائے۔

---

(۱) کشف الظنون: ۱/ ۴۸۔

مطالعہ بامقصد ہو

مطالعہ ہمیشہ بامقصد ہونا چاہئے محض یونہی، وقت نکالنے کے لئے کوئی بھی کتاب ہاتھ میں لے لی، دو چار ورق پڑھ لیا اور پھر رکھ دیا، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، لائبریری گئے، کسی بھی الماری کے پاس کھڑے ہوکر بلا ارادہ کوئی کتاب ہاتھ میں لے لی اور پڑھنے لگے، یہ وقت کا ضیاع ہے، اس کا بڑا نقصان یہ ہے کہ آپ کا دماغ جسے علم کی لائبریری ہونا چاہئے، معلومات کا کباڑ خانہ بنتا ہے، جہاں سے وقت ضرورت کوئی چیز ڈھونڈ نا آسان نہیں ہوتا، بے مقصد مطالعہ کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ چوں کہ انسان اسے بالارادہ نہیں پڑھتا ہے؛ اس لئے وہ باتیں اس کے ذہن میں محفوظ نہیں رہتیں اور یہ محض بیکاری کا ایک مشغلہ بن کر رہ جاتا ہے؛ حالاں کہ وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ ہم اس کو اس طرح سے بے کار نہ ضائع جانے دیں۔

بامقصد مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کون سی کتاب پڑھنا چاہتے ہیں اور کیوں پڑھنا چاہتے ہیں، آپ فقہ پر کوئی کتاب پڑھنا چاہتے ہیں، تو آپ کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ میں فقہ کے جس بحث کے تعلق سے پڑھنا چاہ رہا ہوں، اس سلسلے میں اچھی کتاب کون سی ہے اور پھر اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے، اگر فقہ کی تاریخ کا مطالعہ کررہے ہیں تو آپ کو کسی استاذ سے پوچھنا چاہئے کہ فقہ کی تاریخ پر اچھی کتاب کون سی ہے، ہر فن میں اور ہر موضوع پر کچھ کتابیں ابتدائی طالب علموں کے لئے ہوتی ہیں، کچھ متوسط درجات والوں کے لئے ہوتی ہیں اور کچھ منتہی طلبہ کے لئے ہوتی ہیں تو آپ تاریخ فقہ کی ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کریں، پھر متوسط درجے کا اور پھر تاریخ فقہ پر لکھی گئی ضخیم کتابوں کا مطالعہ کریں، اسی طرح فقہ کی اصطلاحات کی بحث ہیں، اس پر بھی متعدد کتابیں ہیں، اہل علم سے، اپنے اساتذہ سے معلوم کریں کہ اس فن میں کون سی کتاب اچھی ہے اور اگر کئی کتابیں ہیں تو پہلے کس کو پڑھا جائے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی دلچسپی کے حساب کسی ایک فن کو خاص کرلیا جائے، اور اسی میں محنت اور مشق کی جائے؛ کیوں کہ یہ دور اختصاص اور مہارت کا ہے، اب جب کہ جسم کے ہر عضو کے تعلق سے ماہر ڈاکٹر ہونے لگے ہیں تو اسی طرح سے کسی ایک فن کو اپنی زندگی کا مقصد اور مطمحِ نظر بنالیں اور اسی میں محنت کریں تو بہت جلد اس فن میں مہارت حاصل کی جاتی ہے، ورنہ اگر ہر فن کے تعلق سے گاہے بگاہے کتابیں پڑھی جائیں اور کسی ایک فن کو خاص نہ کیا جائے تو یہ ہوسکتا ہے کہ مطالعہ میں تھوڑی وسعت ہو، انسان مختلف علوم وفنون سے واقف ہو؛ لیکن اس کے مطالعہ میں گہرائی و گیرائی نہیں ہوگی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی دورِ حاضر کے فضلاء سے شکایت یہی تھی کہ ان کے علم میں وسعت تو ہے، گہرائی نہیں ہے اور گہرائی جبھی آسکتی ہے کہ انسان اس فن کے لئے خود کو خالص کرلے،

مشہور محدث، فقیہ اور لغوی امام ابوعبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ جب کبھی متعدد علوم وفنون کے ماہر نے مجھ سے بحث کی، مناظرہ کیا تو میں اس پر غالب آ گیا اور جب میں نے کسی ایک علم وفن کے ماہر شخص سے مباحثہ کیا تو مغلوب ہو گیا۔(۱)

حاجی خلیفہ کشف الظنون مین حصول علم کے آداب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ومنها : أن لا يدع فناً من فنون العلم إلا وينظر فيه نظرا ، يطلع به على غايته ، ومقصده ، وطريقته ، وبعد المطالعة في الجميع أو الأكثر إجمالا ، إن مال طبعه إلى فن ، عليه أن يقصده ، ولا يتكلف غيره ، فليس كل الناس يصلحون للتعلم ، ولا كل من يصلح لتعلم علم ، يصلح لسائر العلوم ، بل كل ميسر لما خلق له ، و إن كان ميله إلى الفنون على السواء ، مع موافقة الأسباب ، ومساعدة الأيام ، طلب التبحر فيها ، فإن العلوم كلها متعاونة ، مرتبطة بعضها ببعض ؛ لكن عليه أن لا يرغب بالآخر ، قبل أن يستحكم الأول ، لئلا يصير مذبذبا ، فيحرم من الكل ۔ (۲)

اور حصول علم کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ علم کے تمام فنون پر نگاہ دوڑائے، اس علم کی غایت، مقصد اور طریقہ کا جائزہ لے اور مطالعہ کے بعد اگر اس کی طبیعت کسی ایک فن کی جانب مائل ہوتی ہے تو اسی کو خاص کر لے اور دیگر فنون میں خواہ مخواہ نہ دخل دے؛ کیوں کہ ہر انسان نہ علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہر شخص جو کسی ایک فن میں مہارت رکھتا ہے، وہ دوسرے فنون کے بھی قابل ہوتا ہے؛ بلکہ ہر ایک کے لئے اس کی طبیعت و مزاج کے افتاد کے سبب اللہ نے کچھ چیزوں کو آسان کر دیا ہے اور اگر اس کی دلچسپی تمام علوم میں برابر ہے، اسباب بھی فراہم ہیں اور فرصت کار بھی ہے تو تمام علوم میں تبحر حاصل کرے؛ کیوں کہ علوم ایک دوسرے سے مربوط، جڑے ہوئے اور باہم دگر معاون ہیں؛ لیکن اس میں بھی ضروری ہے کہ پہلے ایک فن کو پختہ

(۱) الالماع للقاضی عیاض:۲۲۱۔ (۲) کشف الظنون:۱/۵۰۔

کرلیا جائے، اس کے بعد دوسرے فن کو حاصل کیا جائے، اگر ایسا نہیں کیا گیا اور ایک
فن میں پختگی حاصل کرنے سے پہلے ہی دوسرا فن حاصل کرنا شروع کردیا تو اس کا علم کچا
رہے گا اور وہ تمام علوم سے محروم رہ جائے گا۔

کتابوں کا انتخاب

بامقصد مطالعہ کی ہی ایک کڑی کتابوں کا انتخاب بھی ہے؛ کیوں کہ جب ایک شخص کے سامنے مطالعہ کا کوئی مقصد ہوگا تو وہ کتابوں کا لازمی طور پر انتخاب کرے گا، اس بات کو بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے بڑے عمدہ مثال اور پیرائے میں اس کو سمجھایا ہے کہ کتابوں کا انتخاب کیوں ضروری ہے اور کیوں ہر کتاب اس لائق نہیں کہ آدمی اس کو پڑھے اور مطالعہ کرے۔

کسی روز بازار جاؤں اور چوک میں سے کسی محض اجنبی شخص کو ساتھ لے آؤں اور اس سے بے تکلفی اور دوستی کی باتیں شروع کردوں اور پہلے ہی روز اس طرح سے اعتبار کرنے لگوں جیسے کسی پرانے دوست پر، تو آپ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر ریل اسٹیشن پر ٹھہرے اور میں اپنی گاڑی سے اتر کر سیدھے بک اسٹال (کتب فروش کی الماری) پر پہنچوں اور پہلی کتاب جو میری ہاتھ لگے، وہ خریدلاؤں اور کھول کے شوق سے پڑھنے لگوں تو شاید آپ کچھ نہ کہیں، حالاں کہ یہ فعل پہلے فعل سے زیادہ مجنونانہ ہے؛ اس کے لئے تو کوئی عذر بھی ہوسکتا ہے، مگر اس کے لئے کوئی عذر ممکن نہیں۔

میں ایک بڑے آباد شہر یا مجمع میں جاتا ہوں، کبھی ایک طرف نکل جاتا ہوں اور کبھی دوسری طرف جا پہنچتا ہوں، اور بغیر کسی مقصد کے اِدھر اُدھر مارا پھرتا ہوں، افسوس کہ باوجود آدمیوں کی کثرت کے میں وہاں اپنے تیں اکیلا اور تنہا پاتا ہوں اور اس ہجوم کا بار اور بھی گراں معلوم ہوتا ہے، میرے کتب خانہ میں بیسیوں الماریاں کتابوں کی ہیں، میں کبھی ایک الماری کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں اور کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی دوسری الماری میں سے کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگتا ہوں، میں اس طرح سینکڑوں کتابیں پڑھ جاتا ہوں؛ لیکن اگر میں غور کروں تو دیکھوں گا کہ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا، اس وقت میری آوارہ خوانی مجھے ستائے گی، اور جس طرح ایک بھرے پرے شہر میں میری تنہائی میرے لئے وبال تھی، اسی طرح اس مجمع علماء، ادباء، وشعراء میں یکہ وتنہا اور حیران رہوں گا۔(۱)

فضول اور بُری کتابوں سے اجتناب

جو طالب علم اور انسان جس قدر لایعنی اور فضول کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، وہ اسی قدر اچھی کتابوں سے دُور

(۱) نصاب اُردو: ۱۳۔

ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ جو وقت وہ ان فضول کتابوں کے پڑھنے میں لگا رہا ہے، وہ وہی وقت اچھی کتابوں کے مطالعہ میں بھی لگا سکتا تھا، وقت بہت قیمتی ہے، یہ دودھاری تلوار ہے، یا تو آپ اسے اپنے لئے فائدہ مند بنائیں یا پھر تیار رہیں کہ یہ آپ کے لئے ضرر رساں اور تکلیف کا باعث بنے گا :

قال الشافعي رضي الله عنه : صحبت الصوفية ، فلم أستفد منهم سوى حرفين ، أحدهما قولهم : الوقت سيف ، فإن لم تقطعه قطعك ، وذكر الكلمة الأخرى ، ونفسك إن شغلتها بالحق و إلا شغلتك الباطل ۔ (۱)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں، میں نے صوفیاءِ کرام سے دو باتیں سیکھی، ان میں سے وقت کی اہمیت پر یہ بات بھی تھی کہ وقت تلوار کے مانند ہے، یا تو تم اس کو استعمال کرو یا یہ تلوار تم پر استعمال ہوگی اور اگر تم نے خود کو بہتر اُمور میں مصروف نہیں رکھا تو باطل اور بُرے کاموں میں تمہارا وقت لگے گا۔

وقت ایک برتن ہے، جس میں ہم آب زمزم بھی رکھ سکتے ہیں اور شراب بھی، عطر بھی ڈال سکتے ہیں اور بدبودار چیز بھی، اگر ہم نے وقت کا استعمال اچھی اور مفید کتابوں کے مطالعہ میں کیا تو گویا ہم نے وقت کے برتن میں زمزم اور عطر رکھا اور اگر ہم نے وقت کو بے ہودہ کتابوں، فلموں، ناولوں اور دیگر خرافات میں صرف کیا تو گویا ہم نے وقت کے برتن میں شراب اور بدبودار چیزیں رکھی۔

انسانی دماغ بھی ایک برتن کے ہی مانند ہے، جامعہ رحمانی میں طالب علمی کے دور میں ایک صاحب نے اس کے بارے میں اچھی مثال دے کر بتایا تھا کہ جیسے ایک دیاسلائی کا ڈبہ ہے، وہ پورا بھرا ہوا ہوتا ہے، اب اگر ہمیں اس میں کسی چیز کو رکھنا ہے تو اسے پہلے خالی کرنا ہوگا، پھر ہم اس میں کچھ رکھ سکیں گے، انسانی ذہن ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو ری انسٹال کیا جائے، یا پھر ہارڈ سک کی طرح مکمل صاف کر دیا جائے؛ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان صرف کام کی اور اچھی باتیں پڑھے، اچھی باتیں سنے اور اچھی باتیں بولے، دوسرے لفظوں میں کہیں تو بُرا دیکھنے، بُرا کہنے اور بُرا سننے سے احتراز کرے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی بے مثل کتاب قیمۃ الزمن اور صفحات من صبر العلماء میں ایسے متعدد علماء اور ائمہ کا ذکر ہے جو بازار سے گزرتے وقت اپنے کان بند کرلیا کرتے تھے؛ تاکہ کوئی فضول اور بے کار بات کان کے راستہ سے گزر کر ان کے دماغ تک نہ پہنچے، یقیناً اس دور میں یہ احتیاط بہت مشکل ہے؛ لیکن اتنا تو ممکن ہے ہی کہ ہم فضول اور بیکار کتابوں سے اپنے ذہن و دل کو خالی رکھیں۔

(۱) قیمۃ الزمن عند العلماء: ۲۵۔

سرسری مطالعہ سے اجتناب

سرسری مطالعہ سے مراد یہ ہے کہ انسان کتاب کھولے اور پڑھتا جائے، اور کیا سمجھا اور کیا نہیں سمجھا، اس کی کچھ فکر نہ کرے، کس لفظ کا صحیح اعراب کیا ہے، اشخاص اور مقامات کے نام کا صحیح تلفظ اور اعراب کیا ہیں، اگر کوئی لفظ ایسا درمیان میں آ گیا ہے، جس کا معنی معلوم نہیں تو تو قیاس سے ایک معنی بطور خود متعین کر لیا، لغت کی جانب رجوع نہیں کیا، سرسری مطالعہ درحقیقت مطالعہ نہیں ؛ بلکہ یہ وقت کے ضیاع کا ایک مہذب طریقہ ہے، اگر انسان کتاب پڑھے، اور نامعلوم لفظ کا معنی معلوم نہ کرے، کسی نام کا صحیح تلفظ و اعراب جاننے کی کوشش نہ کرے، کوئی مغلق اور پیچیدہ بحث ہے تو اس کے حل کی جانب توجہ نہ کرے، تو ایسے مطالعہ سے کوئی فائدہ نہیں، اس طرح سے مطالعہ کرنے والے علمی مباحث میں کبھی بھی پُر اعتماد نہیں ہو سکتے۔

مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ طالب علم اور مطالعہ کرنے والا ہر لفظ کا صحیح اعراب معلوم کرنے کی کوشش کرے، اگر کسی شخص یا مقام کا نام درمیان میں آیا ہے تو اس کا صحیح اعراب کیا ہے، معلوم کرے، اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر بھی توجہ دے اور اگر اس لفظ یا مقام و نام سے متعلق کوئی محاورہ ہے تو اس کو بھی جاننے کی کوشش کرے، کوئی مغلق اور پیچیدہ بحث ہے تو اس پر بھی توجہ کرے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرے، اس طرح سے اگر کوئی مطالعہ کرے گا تو ابتداء میں ہو سکتا ہے کہ اس کی رفتار سست ہو گی اور اسے تھوڑا بوجھ اور بار محسوس ہو گا؛ لیکن اس طرح کے مطالعہ سے علم پر اعتماد پیدا ہوتا ہے اور ایسا شخص کسی بھی مجلس اور محفل میں اپنی بات پورے اعتماد کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔

مطالعہ کا طریقہ

اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے انسان یہ طے کرے کہ اسے کیا پڑھنا اور کتنا پڑھنا ہے، مثال کے طور پر اسے ہدایہ کتاب الطہارۃ سے ایک باب پڑھنا ہے، پہلی مرتبہ وہ صرف عبارت خوانی کرے اور الفاظ کے صرف ونحو اور اعراب پر توجہ دے، دوسری مرتبہ وہ مشکل الفاظ یا جن کے معانی معلوم نہ ہوں، یا جو بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو، ان کو نشان زد کرے، تیسری بار میں پہلے مشکل اور نامعلوم الفاظ کے معنی معلوم کرے، شروحات کی مدد سے مشکل اور پیچیدہ مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کے بعد ایک بار پھر مطالعہ کرے، اس تیسری مرتبہ کے مطالعہ میں اسے پوری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی، چوتھی مرتبہ وہ یہ کرے کہ اس بحث کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھنے کی کوشش کرے، پھر ملا کر دیکھے کہ کوئی ضروری بات چھوٹ تو نہیں گئی ہے، اس سے زیر بحث موضوع آپ کے دماغ میں پورے طور پر ذہن نشیں ہو جائے گا، مولانا شاہ مسیح اللہ خان شروانیؒ نے اپنے رسالہ اسٹرائک میں مطالعہ کے تعلق سے لکھا ہے :

اول تو لغت اور صرف کے اعتبار سے سوچنا اور سمجھنا ضروری ہو گا کہ کون سا صیغہ اور کیا

معنی ہیں، دوسری محنت علم نحو اور ترکیب کے اعتبار سے دیکھنا اور سوچنا ہوگا کہ ترکیب میں کیا واقع ہے اور اعراب کے لحاظ سے اسے کس طرح پڑھا جائے، تنوین کے ساتھ یا بلا تنوین، حرکات ثلاثہ میں سے کس حرکت کے ساتھ پڑھنا صحیح ہوگا، تیسری فکری محنت یہ ہوگی کہ ماقبل و مابعد کے اعتبار سے ترجمہ کس طرح کرنا صحیح ہوگا۔

آج ہم بہت ساری کتابیں پڑھ لیتے ہیں؛ لیکن اعراب اور تلفظ کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں ہوتے، کسی محفل میں اپنی بات کو رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں یا اگر کوئی ہمیں ٹوک دے تو ہم متذبذب ہوجاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا مطالعہ سرسری مطالعہ ہوتا ہے، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ نہیں ہوتا، اگر ہم مطالعہ گہرائی کے ساتھ کریں، بقول مولانا آزادؒ ہر لفظ پر اعتکاف کریں تو پھر ہمیں اپنی بات پر اعتماد ہوگا اور کسی دوسرے کے ٹوکنے سے ہمارا اعتماد زائل نہیں ہوگا۔

مطالعہ میں یکسوئی اور انہماک

کسی بھی کام میں کامیابی کے لئے مکمل توجہ اور انہماک ضروری ہے، اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں، انسان چاہے کسی بھی فیلڈ اور میدان میں کامیاب ہونا چاہے اور مہارت حاصل کرنا چاہے، اس کے لئے دلی انہماک اور پوری توجہ انتہائی ضروری ہے، اس کے بغیر ہوسکتا ہے کہ کسی ادارہ سے رسمی طور پر ڈگری مل جائے؛ لیکن ایسا شخص حقیقی زندگی میں یقینی طور پر ناکام ہوگا، مطالعہ میں مزید توجہ اور انہماک کی ضرورت ہے؛ تاکہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ ذہن نشیں اور دماغ میں جاگزیں ہوجائے۔

آپ کو اس کا بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے ذہن ودماغ پر چھا جاتی ہیں اور ہم اس کو چاہ کر بھی بھول نہیں سکتے اور بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے ذہن سے نکل جاتی ہیں، جو باتیں ہمارے دل ودماغ میں بیٹھ جاتی ہیں، پیوست ہوجاتی ہیں، یہ وہی باتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم نے پوری توجہ کے ساتھ سنا اور دیکھا ہے، ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم راستہ چل رہے ہیں اور دل ودماغ میں کچھ اور سوچ رہے ہیں تو ہمیں قطعاً نہیں پتہ چلتا کہ ہم نے راستہ میں کیا کیا دیکھا، یہ سب توجہ اور انہماک کے کرشمے ہیں، مطالعہ میں بھی اسی توجہ اور انہماک کی ضرورت ہے، ہم آج بزرگان دین، محدثین، فقہاء اور علماء کے محیر العقول حافظہ کے بارے میں پڑھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں، اگر غور کریں تو جہاں اس میں ان مضبوط یادداشت ایک سبب ہے، وہیں اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کو علم سے بے انتہا محبت تھی، علم کے حصول اور طلب کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے؛ لہٰذا جب وہ کچھ پڑھتے تھے تو پوری دنیا ومافیہا کو بھول کر پڑھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ پڑھی ہوئی، سنی ہوئی باتیں

ان کے دل ودماغ میں اس گہرائی کے ساتھ پیوست ہوجاتی تھیں کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود مکمل طور پر محفوظ رہتی تھیں، امام بخاری علیہ الرحمہ جن کے نام سے ہر خاص وعام واقف ہے اور جن حافظہ ضرب المثل ہے دیکھئے وہ حافظہ اور یادداشت کے تعلق سے کتنی اہم بات فرمارہے ہیں :

بَلَغَنِي اَنَّ اَبَا عَبْدِ اللهِ شرِبَ دوَاءَ الحِفْظِ يُقَالُ لَهُ : بَلاَذُر ، فَقُلْتُ لَهُ يَوْماً خلوَةً : هَلْ مِنْ دوَاءٍ يشربُهُ الرَّجُلُ ، فينتفعُ بِهِ لِلْحفظِ ؟ فَقَالَ : لاَ اَعْلَمُ ، ثُمَّ اَقبلَ عليَّ ، وَقَالَ : لاَ اَعْلَمُ شَيْئاً اَنْفَعَ لِلْحفظِ مِنْ نَهْمَةِ الرَّجُلِ ، وَمُدَاوِمَةِ النَّظَرِ ۔ (۱)

محمد بن یوسف (امام بخاری کے خاص شاگرد) کہتے ہیں، مجھے یہ خبر پہنچی کہ ابوعبداللہ (بخاری) نے قوت یادداشت کی دوا پی ہے جس کو بلاذُر کہتے ہیں، ایک دن میں نے ان سے خلوت میں پوچھا، کیا کوئی ایسی دوا ہے جس کے پینے سے حافظہ مضبوط اور یاد داشت تیز ہوجائے، امام بخاری نے جواب دیا، میں ایسی کسی دوا کے بارے میں نہیں جانتا، پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: یادداشت کے لئے آدمی کے شوق، لگن اور کتابوں میں بار بار نگاہ کرنے سے بہتر کوئی چیز میرے علم میں نہیں ہے۔

امام بخاریؒ کے حافظہ کی مثال دی جاتی ہے؛ لیکن امام بخاریؒ کس اہتمام سے علم حاصل کرتے تھے؟ حصول علم کے لئے ان کی لگن کیسی تھی؟ علم سے ان کی محبت کا عالم کیا تھا؟ علم کی طلب میں وہ کتنی محنت کرتے تھے اور کیسی کیسی مشقتوں کو برداشت کرتے تھے اور دنیا کی دلفریبیوں سے کس طرح خود کو الگ رکھتے تھے؛ تاکہ علم اور ان کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ رہے، ان اُمور پر ہماری نگاہ نہیں جاتی، یہی وجہ ہے کہ ہم یہ سوچ کر قناعت کر لیتے ہیں کہ امام بخاری کو اللہ نے زبردست حافظہ دیا تھا، ہمیں نہیں دیا ہے؛ لہٰذا ہم ان جیسے نہیں بن سکتے، یہ دراصل ایک شیطانی وسوسہ ہے، امام بخاریؒ نے حصول علم کے لئے جو محنت کی تھی، علم سے انھیں جو محبت تھی، وہی چیز آپ اپنے اندر پیدا کریں تو پھر آپ بھی امام بخاری بن سکتے ہیں اور اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ ان سے بھی اونچا مقام پاسکتے ہیں، شرط صرف علم سے محبت اور حصول علم کے لئے محنت اور اس راہ میں پیش آنے والی پریشانیوں، مشکلات اور مصائب پر صبر ہے۔

دوران مطالعہ ضروری چیزوں کو نوٹ کرنا

مطالعہ کے دوران ایک بڑی کوتاہی جو ہم سے سرزد ہوتی ہے کہ ہم مطالعہ کے دوران سامنے والی آنے والی

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۸۶/۱۰۔

ضروری اور قیمتی علمی نکات کو کسی بیاض یا کاپی میں محفوظ نہیں کرتے ؛ حالاں کہ یہ بہت ضروری ہے، اب جب کہ حافظے کمزور ہو گئے ہیں، صبح کی بات شام تک یاد نہیں رہتی، حصول علم کا جذبہ کمزور پڑ گیا ہے، ایسے میں ضروری ہے کہ مطالعہ کے دوران پیش آمدہ قیمتی نکات کو ہم نوٹ کرتے جائیں، اس طرح وہ قیمتی نکتہ محفوظ ہو جائے گا اور ہم وقت ضرورت اس سے استفادہ کر سکیں گے؛ کیوں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ کتاب اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہے، یا ہم نے وہ مطالعہ لائبریری میں کیا ہوتا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ بات حافظہ سے محو ہو جاتی ہے اور کتاب ہمارے پاس نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ہم اس سے رجوع کر سکیں۔

علمی نکات کو محفوظ کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی پڑھنے کے بعد جب اس کو لکھتا ہے تو لکھنے سے وہ چیز ذہن میں مزید نقش ہو جاتی ہے، پھر اس بیاض کو بار بار دیکھنے سے وہ علمی نکات مزید ذہن میں پیوست اور راسخ ہو جاتا ہے، علمی نکات محفوظ نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے ایسا لگتا ہے کہ وہ بات پوری طرح سے ہمارے ذہن میں نقش ہے، اس کو لکھنے کی ضرورت نہیں؛ لیکن کل ہو کر ہم اسے بھول چکے ہوتے ہیں اور تیسرے دن ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ہم نے کیا پڑھا تھا اور وہ علمی نکتہ کیا تھا؟

کبھی کبھی یہی محفوظ کی ہوئی باتیں، علمی نکات وافادات آگے چل کر کسی بیش قیمت تصنیف کا باعث بن جاتی ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مشہور مسلم ماہر فلکیات خیام کی سوانح حیات خیام بیس سال میں لکھی، ایسا نہیں تھا کہ وہ بیس سال تک لگا تار اسی تصنیف میں لگے رہے؛ بلکہ وہ اس دوران دوسری علمی وتصنیفی خدمات انجام دیتے رہے؛ لیکن خیام کے تعلق سے تحقیق بھی کرتے رہے اور خیام کے بارے میں دوران مطالعہ جو کچھ ملتا رہا، اس کو الگ سے نوٹ کرتے رہے اور بیس سال کے بعد جب اس قدر مواد جمع ہو گیا جس سے خیام پر لکھا جا سکے تو پھر خیام پر ایک شاہکار کتاب لکھی، جس کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ نے سید سلیمان ندویؒ کو خط میں لکھا :

آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اب اس پر کوئی مغربی یا مشرقی اضافہ نہیں کر سکے گا۔

مشہور عرب عالم ومحقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اپنی مقبول تصنیف قیمۃ الزمن عندالعلماء بیس سال میں لکھی؛ چنانچہ وہ خود اس تعلق سے لکھتے ہیں :

وكتابي قيمة الزمن عندالعلماء على مافيه من قصور ، حصيلة نحوعشرين سنة ، من مطالعاتي ، ومراجعاتي ، في كتب العلم : التفسير ، والحديث ، والفقه ، والتاريخ ، والرجال والتراجم ، والبُلدان ، واللغة ، والنحو ، والادب ، والاخلاق ، وسواها في جمع مادية وانتخابها وضبطها وعزوها الى مصادرها ومراجعها ،

والمقابلة بينها ، وتمحيصها وسبكها ، وتحقيقها ، واخراجها بأبهى حلة ۔ (۱)

اور میری کتاب قیمۃ الزمن عند العلماء باوجود خامیوں اور کوتاہیوں کے میری بیس سالہ محنت کا نتیجہ ہے جو میں نے تفسیر، حدیث، فقہ تاریخ، رجال، تراجم، بلدان، لغت، نحو، ادب، اخلاق ودیگر علم کے فنون کی کتابوں سے جمع منتخب کیا، اس کو درست کیا، ان اقتباسات کو اس کے مصادر ومراجع کی جانب منسوب کیا، پھر مختلف کتب سے اس کا مقابلہ کیا اور باریک بینی سے جائزہ لیا، اور اس کی تحقیق اور اس کو بہتر بہتر انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیس سال تک صرف اسی ایک کتاب میں لگے رہے؛ بلکہ دوران مطالعہ اس تعلق سے جو باتیں سامنے آتی رہیں، ان کو نوٹ کرتے رہے اور جب وہ ایک معتد بہ تعداد میں جمع ہوگئیں تو اس کو سلیقے کے ساتھ شائع کردیا۔

علم وادب کی دنیا میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، مولانا اپنی طالب علمی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے اسباق کے نوٹ بنانے کے ثمرات اور فوائد کے بارے میں لکھتے ہیں :

ایک مرتبہ ایسا خیال ہوا کہ سبق سے پہلے سبق کا مطالعہ کرکے اور حواشی وشروح دیکھ کر اس کا بیان وحل لکھ لوں ...... یہ کتابت کی پہلی مشق تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس طریقے سے ایسا عجیب وغریب فائدہ ہوا، جس کی قدر وقیمت اب معلوم ہوتی ہے، دقیق سے دقیق کتاب کو صرف صبح کے وقت درس سے ایک دو گھنٹے پہلے ایک مرتبہ دیکھا اور اس کی تشریح وتوضیح قلم بند کی، اس کے بعد اساتذہ سے درس لیا اور ہنگام درس بطور نوٹ کے اسے مکمل کرتا رہا، پھر کتاب اسی گوشے میں ڈال دی، جس گوشے میں ہمیشہ رہتی تھی...... اب تک وہ مباحث اس طرح آنکھوں کے سامنے ہیں، گویا ابھی لکھ کر اُٹھا ہوں، درس کی صدا، مطالعے کی نگاہ، حافظے میں اتنی روشن نہیں ہے، جس قدر وہ نقوش جو لکھنے میں قلم سے نکلے، بعد کو جب حافظہ واستحضار کے علمی مباحث نظر

(۱) قیمۃ الزمن عند العلماء مقدمہ طبع خامس: ۶۔

> سے گزرے تو معلوم ہوا کہ یہ اس فن کے مسلمات سے ہے کہ ذہن پر ایک تحریر وکتابت کا جتنا قوی اثر پڑتا ہے، وہ سو مرتبہ بھی کسی چیز کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔(۱)

مولانا آزاد کے والد کی نصیحت ان کو ہمیشہ یہی تھی کہ کتاب کا مطالعہ بغیر نوٹ لئے نہیں کرنا چاہئے، چاہے کسی بھی طرح ہو؛ لیکن مطالعہ کا نوٹ ضرور لینا چاہئے، مولانا آزاد لکھتے ہیں :

> والد مرحوم ہمیشہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ بلا نوٹ کرنے کے کبھی مطالعہ نہ کرو، اگر لکھنے کے لئے کوئی بیاض نہ ہو تو کتاب کے صفحے پر ہی لکھو، صفحے میں لکھنے کے لئے گنجائش نہ ہو تو صرف ایک نشان ہی دے دو، مگر کوئی نہ کوئی قلم کا عمل ضرور کرنا، اس طرح کتاب کے تمام مباحث ہمیشہ کے لئے ذہن میں محفوظ رہیں گے۔(۲)

تیز مطالعہ کی عادت ڈالنا

بچہ شروع میں چلنا سیکھتا ہے تو بار بار گرتا ہے، چوٹ لگتی ہے؛ لیکن اپنی کوشش ترک نہیں کرتا، پہلے وہ دیوار پکڑ کر یا پھر کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلنا سیکھتا ہے، ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ دوڑتا بھاگتا ہے، انسان دوڑنے پر محنت کرتا ہے تو ایک دن وہ آتا ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ دوڑ کر طے کرنے کا ریکارڈ بنالیتا ہے، یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ اس نے دوڑنے پر محنت کی ہے، انسان بولنے پر محنت کرتا ہے تو کم وقت میں زیادہ بولنے کا ریکارڈ بناتا ہے، کوئی کمپیوٹر پر ٹائپ کرتا ہے، محنت اور مشق کے بعد وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ الفاظ ٹائپ کرنا سیکھ لیتا ہے، ٹھیک ایسے ہی اگر مشق کی جائے اور مسلسل کی جائے تو مطالعہ میں تیزی آسکتی ہے، اور کم وقت میں انسان زیادہ پڑھ سکتا ہے۔

آپ پہلے دھیان دیں کہ آپ کے مطالعہ کی رفتار کیا ہے؟ یعنی ایک گھنٹہ میں کتنے صفحات پڑھ لیتے ہیں؟ پھر اس پر دھیان دیں کہ وہ کون سے الفاظ اور جملے ہیں جہاں پر آپ اٹکتے ہیں، اسی کے ساتھ مطالعہ کی رفتار کو دھیرے دھیرے تیز کرنے کی کوشش کریں، آج اگر ایک گھنٹہ میں تیس صفحہ پڑھا ہے تو کوشش کریں کہ اگلے ہفتہ آپ ایک گھنٹے میں چالیس صفحات مکمل کرلیں، جب آپ اس طرح سے لگا تار کوشش کرتے رہیں گے تو یقیناً وہ دن دور نہیں جب آپ کم وقت میں زیادہ مطالعہ کرسکیں گے۔

---

(۱) آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی:۲۶۸۔ (۲) آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی:۲۶۹۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد مولانا فخر الدین صاحب فرماتے ہیں :

میرا جس سال دورہ تھا، حضرت کے کمرے سے متصل ہی میرا کمرہ تھا؛ اس لئے آپ نماز کے لئے تشریف لے جاتے ہوئے گاہے گاہے میرے کمرے پر رُک جاتے، ایک بار میں فتح الباری (شرح بخاری) کا مطالعہ کر رہا تھا، دریافت فرمایا کہ روزانہ کتنے صفحات کا مطالعہ کرتے ہو، میں نے عرض کیا، تیس پینتیس صفحات کا مطالعہ معمولاً جاری ہے، ارشاد ہوا کہ بہت کم مقدار ہے، میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں بیس روز میں فتح الباری کی تیرہ جلدیں مکمل دیکھ ڈالی تھیں۔(۱)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد اور داماد مولانا احمد رضا صاحب بجنوری لکھتے ہیں :

مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ مسند احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا اور وہ بھی اس شان سے کہ اس عظیم الشان ذخیرے سے احناف کی تائید میں جس قد احادیث ہو سکتی تھیں، وہ بھی منتخب اور محفوظ کر لیں اور پھر جب کسی درس میں مسند کی احادیث کا حوالہ دینا ہوتا تو ہمیشہ بغیر مراجعت کے دیتے تھے اور روات وطبقات پر بھی بے تکلف بحث فرماتے تھے۔(۲)

حضرت مولانا یوسف بنوریؒ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے سریع وتحقیقی مطالعہ کے تعلق سے لکھتے ہیں :

شاہ صاحب نے ۱۳۲۱ھ میں فتح القدیر لابن ہمام کا مع تکملہ بیس دن کے اندر مطالعہ فرمایا اور اس طرح سے کتاب الحج تک اس کی تلخیص فرمائی، اور ابن ہمام نے فتح القدیر میں صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، اپنے خلاصے میں ان کے مکمل جوابات بھی قلم بند کئے۔(۳)

موجودہ امیر شریعت بہار واڑیسہ حضرت مولانا ولی رحمانی مدظلہ العالی سے ایک مرتبہ میں نے سنا: دیوبند میں دوران طالب علمی ان کا روزانہ کا خارجی مطالعہ پانچ سو صفحات کا ہوا کرتا تھا، آج ہمارے لئے روزانہ کا ایک سو صفحہ ہونا بھی مشکل ہے۔

---

(۱) نقش دوام، باب علمی انہماک: ۱۱۴۔

(۲) مقدمہ انوار الباری: ۲/ ۲۴۱۔

(۳) حیات انور: ۱/ ۱۳۸۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی زندگی بہت مختصر ہے، اگر اس میں کچھ کرنا ہے، کچھ بننا ہے تو کم وقت میں زیادہ کام کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہم اپنی عمر کو بڑھا نہیں سکتے، دن رات کے چوبیس گھنٹے کی جگہ تیس گھنٹے نہیں کر سکتے، سات دن کے ہفتہ کو دس دن کے ہفتہ میں تبدیل نہیں کر سکتے، لازماً اب یہی کر سکتے ہیں کہ جتنے بھی لمحات ہمیں مل رہے ہیں، اس میں زیادہ سے زیادہ کام کریں اور اس کام کو تیزی سے کرنے کی عادت ڈالیں۔

مطالعہ کسی کی رہنمائی میں ہو

مطالعہ کو نافع اور کارآمد بنانے کے لئے ضروری ہے کہ جس فن کی کتاب کا آپ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اولاً اس فن کے کسی واقف کار اور ماہر سے اس سلسلہ میں مشورہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ اس فن میں میرے لئے کن کتابوں کا مطالعہ مفید اور نافع ہوگا؟ اور پھر ان کتابوں کے مطالعہ میں کیا ترتیب ہونی چاہئے، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اختصاص کسی موضوع پر مرتب مطالعہ کا نام ہے، اور انھوں نے مثال سے یہ بات بتائی :

> اگر علوم قرآن کے موضوع ناسخ ومنسوخ پر مطالعہ کرنا ہے تو اس کی درست ترتیب یہ ہے کہ پہلے علامہ سیوطی کی الاتقان کا مطالعہ کیا جائے، اس میں علامہ سیوطی نے صرف بیس احکام قرآنی کو منسوخ مانا ہے اور متقدم مفسرین جنھوں نے نسخ میں وسعت کی تھی، یعنی عام کو خاص کرنا اور مطلق کو مقید کرنا بھی ان کے نزدیک نسخ تھا، سبھی میں تطبیق دے کر محض بیس آیتوں کو منسوخ مانا ہے، الاتقان کے بعد مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی اُصول تفسیر پر لکھی گئی کتاب الفوز الکبیر کے ناسخ ومنسوخ کے باب کا مطالعہ کریں، اس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے سیوطی کے بیس منسوخ قرآنی احکام میں سے پندرہ میں تطبیق دیا ہے اور فرمایا ہے کہ محض پانچ قرآنی آیات منسوخ ہیں، امارت شریعہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ کے پہلے قاضی شریعت مولانا عبدالصمد رحمانی نے ناسخ ومنسوخ کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''قرآن محکم'' ہے، اس کتاب میں مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نے ان پانچ آیات کو بھی محکم اور قابل عمل مانا ہے اور فرمایا ہے کہ قرآن پاک کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو مکمل طور پر منسوخ ہو اور ماننسخ من آیۃ اوننسھا الخ کی تاویل کی ہے۔

حضرت مولانا رحمانی مدظلہ العالی کے اس ارشاد گرامی سے جہاں ایک طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی موضوع

پر مطالعہ کی ترتیب کیا ہونی چاہئے ، وہیں مطالعہ میں کسی بڑے کی رہنمائی کی ضرورت کا بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے ماضی کے تقریباً تمام علماء اپنے اساتذہ کی نگرانی اور رہنمائی میں مطالعہ کرتے تھے اور جہاں کوئی اشکال پیش آتا تھا، وہ ان سے دریافت کرتے تھے،صوفیاءکرام بھی مشائخ صوفیاء کی کتابوں کا مطالعہ اپنے شیخ یا کسی محقق صوفی کی نگرانی میں کرتے تھے۔

کسی کی نگرانی میں مطالعہ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان خودرائی سے بچتا ہے، بہت سے علمی مقامات ایسے بھی ہیں، جہاں اگر اپنے استاذ کی رہنمائی نہ حاصل کی جائے تو انسان گمراہ ہوجاتا ہے اور یہی بہت سارے ذہین افراد کے ساتھ پیش آیا ہے کہ انھوں نے اپنی علمی قابلیت پر بھروسہ کیا اور خود سے مطالعہ شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ علم کے مشکل مقامات سے سالم طور پر نہ نکل سکے اور گمراہ ہو گئے ،حضرت ابن وہب بڑے محدث ہیں، امام مالک کے خصوصی شاگرد ہیں، وہ فرماتے ہیں :

عَنِ ابْن وهب ، قَالَ : لولا مالك بْن أنس ، والليث بْن سعد هلكت ، كنت أظن أن كل ما جاء عَنِ النَّبِيّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يفعل به ۔ (۱)

اگر مالک بن انس اور لیث بن سعد نہ ہوتے تو میں ہلاک ہوجاتا، میرا گمان یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ سے منقول ہر روایت قابل عمل ہے (جب کہ بعض روایات منسوخ یا دوسری وجوہات کی بناء پر نا قابل عمل ہوتی ہیں اور ان پر عمل درست نہیں ہوتا)۔

وَقَال حرملة بْن يَحْيَى أيضاً : سمعت ابن وهْب يَقُول : لولا اللَّيْث ومالك لضللنا ۔ (۲)

ایک دوسری روایت میں ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر لیث اور مالک نہ ہوتے تو ہم گمراہ ہوجاتے۔

کسی کی نگرانی میں مطالعہ کا ایک مزید فائدہ یہ ہے کہ انسان کا علمی سفر آسان ہوجاتا ہے، جیسے کسی انجان راستے پر چلنے میں اگر اس راستہ سے واقف ایک شخص آپ کی رہنمائی کرتا ہے تو آپ کا راستہ آسان ہوجاتا ہے، اور یہ بھی مثل ہے کہ السعید من وعظ بغیرہ، خود ٹھوکریں کھا کر تجربہ حاصل کرنے سے بہتر ہے کہ انسان دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرے اور سبق سیکھے۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ۱۴/ ۵۲۴۔ (۲) تہذیب الکمال: ۲۴/ ۲۷۰۔

مطالعہ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ

امام بخاری کا یہ قول ماقبل میں گذر چکا ہے کہ انسان جتنے شوق، دلچسپی، انہماک اور یکسوئی سے مطالعہ کرتا ہے، پڑھتا ہے، وہ باتیں اس کے ذہن ودل میں اتنی ہی زیادہ محفوظ ہوتی ہیں، اور یہ بات بھی گذر چکی ہے کہ دوران مطالعہ علمی نکات محفوظ کرنا چاہئے، ان سب کے علاوہ کچھ اور بھی طریقے ہیں، جن سے مطالعہ کے مواد کو ذہن ودل میں محفوظ کیا جا سکتا ہے :

اول یہ کہ مطالعہ کے دوران ایک گھنٹے، آدھے گھنٹے کے بعد دس پندرہ منٹ کا بریک لیں اور آنکھ بند کر کے یاد کریں کہ آپ نے کیا پڑھا تھا اور اب کتنی باتیں آپ کو یاد ہیں، اگر ضرورت محسوس ہو تو اسی مطالعہ کئے ہوئے کا دوبارہ مطالعہ کریں اور ان باتوں کو اپنے ذہن ودماغ میں بسانے کی کوشش کریں۔

جب میں جامعہ رحمانی مونگیر (بہار) میں زیر تعلیم تھا تو ایک مرتبہ حضرت مولانا ظاہر حسین صاحب (استاذ حدیث) نے فرمایا تھا کہ مطالعہ کو محفوظ رکھنے کا آسان اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ دن بھر جو کچھ آپ نے پڑھا ہے، اس کو سونے سے پہلے یادداشت سے دوہرائیں، اور اس کا مسلسل اہتمام کریں، اس سے یادداشت بھی مضبوط ہوجاتی ہے، اور پڑھا ہوا، مطالعہ کیا ہوا بھی ذہن میں نقش ہوتا ہے۔

مطالعہ میں بعض اوقات کو بھی خاص دخل ہے؛ کیوں کہ دن ورات کے چوبیس گھنٹے میں بعض اوقات ایسے ہیں، جس میں یکسوئی زیادہ ہوتی ہے، دل زیادہ لگتا ہے اور کتاب جلد یاد ہوجاتی ہے، مطالعہ کے لئے سب سے بہتر وقت صبح کا وقت مانا گیا ہے، اس وقت شور وغل نہیں ہوتا، سوکر اُٹھنے کے بعد دماغ ودل وساوس اور منتشر خیالات سے پاک وصاف ہوتا ہے، اس وقت جو پڑھا جائے وہ جلد یاد ہوجاتا ہے؛ لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، ہر شخص کی طبیعت الگ الگ ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی اور کو کسی خاص دوسرے وقت میں زیادہ نشاط حاصل ہوتا ہو، اس کو اسی وقت مطالعہ کرنا چاہئے اور جب طبیعت اُکتانے لگے تو کتاب کا مطالعہ چھوڑ کر آنکھیں بند کر کے مطالعہ کی ہوئی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اس سے ایک جانب آنکھوں کو آرام ملے گا اور دوسری جانب مطالعہ کی ہوئی باتیں زیادہ محفوظ ہوں گی۔

کتاب کا بار بار مطالعہ کرنا

کسی کتاب کو پڑھنے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اس میں لکھی باتوں کو سمجھیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک کتاب ایک مرتبہ پڑھنے سے سمجھ میں نہیں آتی، ہم کم ہمت طالب علموں کا طریقہ تو یہ ہے کہ اگر کتاب سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو مطالعہ موقوف اور کتاب میز پر رکھ دی یا لائبریری کو واپس کر دی، اس سے زیادہ ہوا تو جو مقام سمجھ میں

نہیں آرہا تھا، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، یہ درست طریقہ نہیں ہے، کتاب میں جو باتیں مشکل اور لاینحل لگتی ہیں، ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، خود سے سمجھ میں نہ آئے تو اپنے اساتذہ سے دریافت کریں، اگر وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکیں تو اس موضوع کے ماہر دیگر علماء سے دریافت کریں، اور ایک مرتبہ کے پڑھنے میں حل نہ ہو تو دو بار پڑھیں، دس بار پڑھیں؛ لیکن اس مسئلہ کو اور کتاب کے اس مقام کو بغیر سمجھے چھوڑ نہ دیں، تاریخ میں ہمیں ایسے متعدد علماء کا ذکر ملتا ہے جو ایک کتاب کا ہزار، سات سو، پانچ سو، ستر اور چالیس چالیس دفعہ مطالعہ کرتے تھے۔

ابونصر فارابی دنیا کے ذہین لوگوں میں سے تھے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ارسطو کی کتاب النفس کا ایک نسخہ کہیں سے ان کو ملا، جس میں ابونصر فارابی کی تحریر میں لکھا ہوا تھا کہ میں نے اس کا کتاب کا دوسو مرتبہ مطالعہ کیا ہے، اور خود ابونصر فارابی کا قول یہ تھا کہ میں نے ارسطو کی کتاب السماع الطبیعی چالیس مرتبہ مطالعہ کیا ہے؛ لیکن اس کے باوجود مجھے اس کتاب کے مزید مطالعہ کی ضرورت ہے، ابن سینا کی ذہانت وفطانت مشہور ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان کو ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعۃ ملی، اس کو انھوں نے چالیس مرتبہ پڑھا؛ لیکن مزید پڑھنے کی اور سمجھنے کی ضرورت باقی رہی، عباس بن الولید الفارسی مشہور محدث ہیں، سفیان بن عیینہ اور فضیل بن عیاض کے شاگرد ہیں، مشہور مورخ ابوالعرب ان کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ مجھ سے احمد بن تمیم نے بیان کیا کہ عباس بن الفارسی کی بعض کتاب پر ان کی تحریر میں لکھا ہوا تھا کہ میں نے اس کتاب کو ہزار مرتبہ پڑھا، ابومحمد عبداللہ بن اسحاق معروف بہ ابن التبان جو مشہور مالکی فقیہ ہیں، ان کے حالات میں مذکور ہے کہ انھوں نے فقہ مالکی کی اہم اور بنیادی کتاب المدونہ کو ایک ہزار مرتبہ پڑھا، مشہور مالکی فقیہ اور محدث ابوبکر الابہری بیان کرتے ہیں کہ میں نے مختصر ابن عبدالحکم پانچ سو مرتبہ، اسدیہ پچھتر مرتبہ، اور موطا کو پینتالیس مرتبہ اور مختصر برقی کو ستر مرتبہ اور مبسوط کو تیس مرتبہ پڑھا ہے، امام غزالی کے رفیق درس اور مشہور شافعی فقیہ امام کیاہراسی فرماتے ہیں کہ نیشاپور کے مدرسہ میں ایک عمارت تھی جس کی ستر سیڑھیاں تھیں، میں جب درس یاد کرلیتا تو ہر سیڑھی پر ایک مرتبہ اس کو دوہرایا کرتا تھا، اس طرح کر کے ایک مرتبہ نیچے سے اوپر جاتا اور دوسری مرتبہ اوپر سے نیچے آتا، یعنی وہ ایک سبق کو ایک سو چالیس مرتبہ دوہرایا کرتے تھے، مشہور محدث ابوبکر غالب بن عبدالرحمٰن بن عطیہ المحاربی کے حالات میں مذکور ہے کہ انھوں نے بخاری شریف سات سو مرتبہ پڑھی تھی (یہ تمام تفصیلات شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی بے مثل کتاب صفحات من صبر العلماء ص: ۱۹۵ تا ۲۰۰ سے ماخوذ ہے، مزید کے لئے اس کی جانب رُجوع کریں) علامہ شبیر احمد عثمانی نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے رسالہ کشف الستر کا سترہ مرتبہ مطالعہ کیا تھا اور فرمایا: اس رسالہ کا مطالعہ سترہ مرتبہ کرنے کے بعد میں سمجھ سکا ہوں کہ حضرت نے کن کن مشکلات واشکالات کا حل فرما دیا ہے۔(۱)

---

(۱) علامہ انور شاہ کشمیری اپنی ہشت پہلو شخصیت کے خدوخال اور آثارِ علمیہ کے شفاف آئینہ میں: ۷۔ ۱۳۔

اس کے علاوہ بھی مزید علماء وائمہ کے حالات میں اس طرح کے واقعات مذکور ہیں کہ انھوں نے ایک کتاب کو بہت دفعہ دوہرایا، پڑھا، مطالعہ کیا، یہ حضرات ائمہ ایک کتاب کو اتنی مرتبہ تین وجھو ں سے دوہراتے تھے اول وجہ یہ تھی کہ کتاب سمجھ میں نہ آرہی ہو، ایک مرتبہ کے مطالعہ سے سمجھ میں نہ آتی تو اُمید رکھتے تھے کہ دوسری مرتبہ کے مطالعہ میں وہ بات سمجھ میں آجائے گی، دوسری مرتبہ کے مطالعہ میں سمجھ میں نہ آتی تو تیسرے مرتبہ کے مطالعہ سے سمجھ میں آنے کی اُمید رکھتے تھے، ہر طالب یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اور دوران مطالعہ کبھی کوئی بات ایک دفعہ کے مطالعہ میں سمجھ میں نہیں آتی ہے، دوسری دفعہ کے مطالعہ میں وہ بات سمجھ میں آجاتی ہے، دوسری وجہ ان کتابوں کو زبانی یاد اور اس کو ذہن میں راسخ کرنا ہوتا تھا، ایک دو مرتبہ پڑھنے سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بات یاد ہوگئی ہے؛ لیکن وہ فوراً زائل بھی ہوجاتی ہے، انسان جتنی مرتبہ جس بات کو دوہراتا ہے وہ بات حافظہ کے لوح پر اتنی ہی شدت سے نقش ہوجاتی ہے، تیسری وجہ برکت کا خیال تھا مثلاً بخاری یا کسی عظیم شخصیت جن سے عقیدت ہوتی تھی ان کی کتاب حصول برکت کے لئے بار بار پڑھی جاتی تھی۔

دماغ میں معلومات کی ترتیب

یہ بہت ضروری بات ہے کہ آپ کے ذہن ودماغ میں مختلف علوم وفنون کے خانے ہوں اور ان خانوں میں متعلقہ معلومات ترتیب سے جمع ہوں، آپ کا دماغ ایک بہترین مرتب اور منظم لائبریری کی طرح ہونا چاہئے، جہاں ہر فن کی کتاب متعلقہ خانہ میں ترتیب سے موجود رہتی ہے اور وقت ضرورت فوراً مل جاتی ہے، آپ کا دماغ کباڑی کا کباڑ خانہ نہیں ہونا چاہئے، جہاں ہر چیز ادھر اُدھر بکھری پڑی ہے، کسی چیز کو ڈھونڈنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔

انسان مطالعہ اس لئے کرتا ہے کہ معلومات اس کی گرفت میں رہیں، اگر انسان کا دماغ ایک مرتب لائبریری نہ بن کر معلومات کا کباڑ خانہ بن جائے تو اس مطالعہ سے کیا فائدہ حاصل ہوا، افسوس اس بات کا ہے کہ آج کل اور آج کل ہی کیوں کہئے ہر دور میں کثرت ایسے لوگوں کی رہی ہے جن کے دماغ منظم لائبریری اور کتب خانہ نہیں؛ بلکہ کباڑی کی دکان بنے رہے، اور اسی لئے وہ ناکام رہے اور جن لوگوں نے اپنی معلومات کو سلیقے سے مرتب کیا، وہ دنیا میں اپنا انمٹ نقوش چھوڑنے میں کامیاب رہے۔

مولانا آزاد، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو ملیح آباد کے پٹھانوں کی تاریخ سلسلہ وارطور پر بتا رہے تھے، مولانا کی معلومات سے متاثر اور حیرت زدہ ہوکر مولانا ملیح آبادی نے پوچھا کہ تعجب ہے یہ معلومات آپ کو کیسے ملیں؟ فرمایا: مولوی صاحب! جو کچھ سامنے آجائے پوری توجہ سے پڑھا کرو، کام کی چیزیں ذہن میں ٹانک لیا کرو، لغویات کو تھوک دیا کرو۔

عرض کیا، یہ کہنے میں تو یہ آسان ہے مگر عملاً کیوں کر ہو؟ فرمایا: نپولین بونا پارٹ کی سوانح تو آپ پڑھ چکے ہوں گے، نپولین بیک وقت سپہ سالار بھی تھا، مؤرخ بھی، ادیب بھی، قانون داں بھی، نپولین کوڈ آج بھی فرانس میں جاری ہے، نپولین نے اپنا یہ قانون زیادہ تر فقہ مالکی سے اخذ کیا تھا، جب وہ مصر میں تھا تو اس نے فقہ مالکی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور جب فرانس کا شہنشاہ بنا تو قانون سازی میں اس نے اپنے مطالعہ فقہ سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔

پھر ذرا رک کر کہنے لگے اور آپ نے نپولین کی سوانح میں یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس کے علم میں فوج کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی موجود رہتی تھی، گھوڑوں کے کتنے زین قابل مرمت ہیں، کتنی لگامیں ٹوٹ گئی ہیں، کتنے گھوڑوں کی نعل بندی آج ہی ہونا چاہئے، غرض کہ کوئی بات اس کے حافظہ سے باہر نہ رہتی اور یہ حافظہ ہی اس کی کامیابیوں کا بڑا سبب تھا، عرض کیا لیکن مولانا! نپولین کو یہ سب یاد کیسے رہتا تھا؟ کہنے لگے، یہی سوال خود نپولین سے کیا گیا تھا اور اس نے جواب دیا تھا کہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں، اگر تم اپنے دماغ کو کباڑ خانہ بناؤ گے، جس میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی تو تمہیں کچھ بھی یاد نہ رہے گا؛ لیکن اگر اپنے دماغ کو اسٹور بنالو، جس میں ہر چیز نظم وقاعدے سے رکھی جاتی ہے تو سب کچھ یاد رکھ سکو گے؛ چنانچہ میں نے بھی اپنے دماغ میں خانے بنا رکھے ہیں، سینکڑوں ہزاروں خانے، یہ خانہ قانون کا ہے، یہ بین الاقوامی سیاست کا، یہ علم تاریخ کا، یہ ریاضی کا، یہ فوج کا، میں اپنی معلومات سلیقہ مند، ماہر اسٹور کیپر کی طرح نظم وترتیب کے ساتھ الگ الگ خانوں میں جمع کرتا ہوں اور جس وقت جن معلومات کی ضرورت پڑتی ہے، اسی کا خانہ کھول لیتا ہوں اور باقی خانے بند رکھتا ہوں، ہر آدمی ایسا ہی کرسکتا ہے۔(۱)

مطالعہ کا شوق کیسے پیدا ہو

شوق بڑی چیز ہے اور شوق کے تیشے سے مشکلوں اور رکاوٹوں کا پہاڑ کھود کر جستجو کی جوئے شیر نکالی جاسکتی ہے؛ لیکن لاکھ ٹکے کا سوال یہ ہے کہ شوق کیسے پیدا ہو، اصل بات تو یہ ہے کہ علم کا شوق، علم سے محبت ایک فطری اور وہبی عطیہ ہے، جیسے کسی کو اللہ حافظہ کی نعمت سے نوازتے ہیں اور کسی کو اس نعمت سے محروم رکھتے ہیں، کسی کو مال ومنال سے مالا مال کردیتے ہیں اور کوئی غربت میں زندگی گزارتا ہے، کوئی شاعرانہ مزاج لے کر پیدا ہوتا ہے :

پیدا ہوئے تھے ہاتھ جگر پر دھرے ہوئے

اور کسی سے ساری زندگی ایک مصرع موزوں نہیں ہوتا؛ لیکن جیسے دنیا میں ہر فطری نعمت کے اکتساب کے کچھ نہ کچھ ذرائع موجود ہیں، مثلاً کسی کو اللہ نے مالدار گھرانے میں پیدا کیا اور کسی کو جھونپڑے میں؛ لیکن اس

---

(۱) ذکر آزاد، مصنف مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی: ۴۳۷/۲۴۷۔

جھونپڑے میں پیدا ہونے والا بھی کوشش اور محنت سے مال دولت حاصل کرسکتا ہے، ایک شخص کا مزاج شاعرانہ نہیں؛ لیکن وہ فن عروض پر مہارت حاصل کرکے شعر گوئی کی صلاحیت پیدا کرسکتا ہے، یہ تسلیم کہ ایک شخص حافظہ کی خداداد نعمت سے سرفراز نہیں؛ لیکن کارآمد طریقوں کو کام میں لاکر وہ باتوں کو یاد رکھنے کی اپنی صلاحیت کو جلا بخش سکتا ہے، شوق بھلے ہی ایک فطری نعمت ہو،؛ لیکن شوق پیدا کرنے کے کچھ مادی اسباب ووسائل بھی ہیں۔

اس کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ صاحبان عزم وہمت کی سوانح اور تراجم کو پڑھا جائے، ان کی سیرت وزندگی اور اخلاق وکردار کا مطالعہ کیا جائے، یہ معلوم کیا جائے کہ علم کی شمع بننے میں کتنی بار پروانوں کی طرح جلنا پڑا، علم وفضل کا آفتاب وماہتاب بننے کے لئے رکاوٹوں اور مشکلات کن صبر آزما اور جاں گسل آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، ان پر کیسے کیسے سخت لمحات آئے، اور انھوں نے کس طرح مشکلات ومصائب کا سامنا کیا اور اپنی منزل پر پہنچ کر دم لیا۔

انسان کے اندر خدا نے اثر پذیری کی بڑی صلاحیت رکھی ہے، جب انسان کے سامنے کسی بڑی شخصیت کا تذکرہ ہوتا ہے تو انسان اس سے متاثر ہوتا ہے اور اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے، کتابوں میں سب سے باعظمت کتاب قرآن پاک اور انسانوں میں سب سے عظیم گروہ انبیاء کرام کا گروہ ہے، آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو بار بار ایسی آیتیں گزریں گی جن میں اللہ نے نبیوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی قوم کو ماضی کے قوم کے واقعات سے متنبہ کریں، ان کو عبرت دلائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ماضی کی قوموں کے واقعات، حوادث، اللہ کے حکموں کو ماننے پر اجر وثواب اور نہ ماننے پر عذاب وعقاب پر مشتمل ہے، اور خود قرآن نے ان واقعات کا مقصد یہی بیان کیا ہے کہ اس میں لوگ غور وفکر کریں، اس سے عبرت ونصیحت لیں، جن پر اللہ کا انعام ہوا، ان کے راستے پر چلیں اور جو لوگ بارگاہ خداوندی میں معتوب ٹھہرے، ان کی روش اور طریقے کی پیروی نہ کریں:

- لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۔ (یوسف:۱۱۱)
- فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۔ (الاعراف:۱۷۶)
- نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ ۔ (یوسف:۳)
- إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۔ (آل عمران:۶۲)

خود حضور پاک ﷺ سے فرمایا گیا کہ یہ واقعات ہم اس لئے بیان کررہے ہیں؛ تاکہ آپ کا دل مطمئن اور پُرعزم رہے:

وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۔ (سورہ ہود:۱۲۰)

خود نبی کریم ﷺ کی احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ماضی کے قوموں اور افراد کے بہت سارے واقعات مذکور ہیں، جن سے ذوق وشوق اور عبرت ونصیحت ملتی ہے، حضرت خباب بن ارتؓ کی حدیث میں ہے کہ جب انھوں نے قبول اسلام پر مصائب اور مشکلات کی شکایت کی تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلی قوموں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تھا کہ ان کے جسم کو لوہے کی کنگھی سے چیر دیا جاتا تھا؛ لیکن وہ اس کے باوجود وہ اپنے ایمان پر قائم رہتے تھے، اس طرح سے حضور پاک نے حضرت خباب اور دیگر مسلمانوں کا کفار مکہ کی ستم رانیوں کے دور میں حوصلہ بڑھایا اور استقامت کی تعلیم دی۔

انسان آسمان علم کے جگمگاتے ستاروں یعنی ائمہ مجتہدین، فقہاء، علماء، محدثین، قراء، مجاہدین، صاحب عزم وعزیمت کے احوال پڑھتا ہے تو اس کے دل میں بھی ویسا ہی بننے کی اور کچھ کر دکھانے کی اُمنگ لہریں لینے لگتی ہیں اور یہی شوق کا پہلا مرحلہ ہے، علماء اور ائمہ نے ذوق وشوق پیدا کرنے میں بزرگوں کے واقعات کو بہت ہی مؤثر مانا ہے، یہ نفسیاتی حقیقت بھی ہے اور بزرگوں کا ارشاد بھی کہ ذوق وشوق پیدا کرنے، حوصلہ اور عزم بیدار کرنے کے لئے بزرگوں کے واقعات، علماء کے حالات، محدثین اور صاحبان عزم وعزیمت کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

دور حاضر میں اس موضوع پر کئی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں، مولانا نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی کا نام محتاج تعارف نہیں، ان کی لکھی ہوئی ''علمائے سلف'' اور نابینا علماء شوق واُمنگ پیدا کرنے کے لئے بہت اچھی کتاب ہے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے تو علمائے سلف کو اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا ہے، دورِ حاضر میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے قلم سے منصۂ شہود پر آنے والی کتابیں قیمۃ الزمن عندالعلماء اور صفحات من صبر العلماء بھی اس باب میں لاجواب ہے، اس کے علاوہ سیر اعلام النبلاء، تذکرۃ الحفاظ، وفیات الاعیان، طبقات الشافعیہ للسبکی اور تذکرہ وتراجم کی دیگر کتابیں پڑھنی چاہئے، اس سے ایک طرف جہاں ہم اپنے اکابر اسلاف کی سیرت وسوانح سے واقف ہوں گے، وہیں ہم میں بھی ان جیسا بننے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوگا۔

● ● ●

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی فقہی خدمات

مفتی محمد خالد حسین نیموی قاسمی ☆

تفقُّہ فی الدین، فقاہت اور دینی بصیرت وہ اعلیٰ ترین صفات ہیں، جن کے حصول کی ترغیب خود رب العالمین نے دی ہے، قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے :

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۔ (التوبۃ:۱۲۲)

اور اہل ایمان کے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں تو ایسا کیوں نہیں ہوا کہ نکلتا ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے ایک گروہ؛ تا کہ وہ دین کا فہم حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبر دار کرتے تا کہ وہ بھی نافرمانی سے بچتے۔

سرور کائنات حضرت محمد ﷺ نے ایسے افراد کے لئے جنھیں دین کی فقاہت حاصل ہوتی ہے، ان کے لئے خیر کی بشارت دی ہے: ''من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین''(۱) اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی فقاہت عطا فرما دیتا ہے، ان ترغیبی ارشادات کے نتیجے میں اُمت نے ہمیشہ فقہ وفقاہت اور علوم فقہ وشریعت کی طرف توجہ دی ہے، صحابہ کرام میں ایک جماعت تھی جنھیں اُمت فقہاء صحابہ کے نام سے یاد کرتی ہے، جس میں حضرات خلفاء راشدین اور عبادلہ ثلثہؓ کے علاوہ حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ نمایاں ہیں، مدینہ کے فقہاء سبعہ سے تاریخ کا کونسا طالب علم ناواقف ہوگا؟ بعد کے زمانہ میں ائمہ مجتہدین کی ایک لمبی فہرست ہے، برصغیر سے تعلق رکھنے والے علماء کا فقہ وفتاویٰ سے دیرینہ تعلق اور والہانہ شغف رہا ہے، فقہ وفتاویٰ

☆ ناظم تعلیمات مدرسہ بدر الاسلام بیگوسرائے بہار، رکن الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین دوحہ قطر۔

(۱) صحیح بخاری، صحیح مسلم۔

اور اُصول فقہ اور متعلقات فقہ پر ایسی نمایاں کتابیں یہاں تصنیف ہوئیں ہیں، جن پر عالم اسلام کو اعتماد ہے، جن میں حجۃ اللہ البالغہ، فتاویٰ تا تار خانیہ، فتاویٰ ہندیہ، صنوان القضاء وعنوان الافتاء، ارکان اربعہ، فتاویٰ عزیزیہ، نور الانوار، تفسیرات احمدیہ، مسلم الثبوت، فواتح الرحموت، السعایہ فی شرح شرح الوقایہ، فقہ کی مختلف کتابوں پر حواشیؒ مولانا عبدالحی فرنگی وغیرہ اس سرزمین پر لکھی جانے والی اس فن کی نمایاں کتابیں ہیں، چودھویں صدی ہجری میں علوم فقہ شریعت کے کئی آفتاب و ماہتاب برصغیر میں جلوہ افروز ہوئے، جن میں فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مفتی سہول بھاگلپوریؒ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، فقیہ النفس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ، مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ وغیرہ کا نام ممتاز مقام کا حامل ہے، اس قافلۂ علم وعرفان میں ایک نمایاں نام حضرت قطب عالم مولانا محمد علی مونگیریؒ کا بھی ہے، حضرت کی شخصیت اگرچہ فقہ وفتاویٰ کے عنوان سے زیادہ مشہور نہیں ہے، ان کا نمایان کارنامہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام اور سرزمین بہار سے فتنۂ قادنیت کا استیصال و بیخ کنی اور لاکھوں فرزندان توحید کے قلوب کو عشق الٰہی اور عشق رسول سے گرمانا ہے، حضرت کا روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونا شہرۂ آفاق ہے؛ لیکن اہل علم وتحقیق کی نظر میں آپ ایک بلند پایہ فقیہ، ماہر شریعت وافتاء بھی ہیں، جس کی گواہی مختلف فقہی موضوعات پر لکھی ہوئی آپ کی تحریر اور رسائل دیتے ہیں۔

حضرت مونگیری رئیس الفقہاء والمحدثین

آپ کے مستفیدین ومسترشدین آپ کو رئیس الفقہاء والمحدثین کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں؛ چنانچہ آپ کے ایک نامور خلیفہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب رحمانی مظفرپوری بانی جامع العلوم مظفرپور "**القول المحکم فی خطابة العجم**" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں :

> الحمدللہ کہ ان دنوں حضرت مولائی ومرشدی قدوۃ السالکین، رئیس الفقہاء والمحدثین، شیخ الزہاد والمجاہدین مولانا سید محمد علیؒ صاحب متع اللہ المسلمین بطول بقاءہ کا ایک فتویٰ دیکھا جوکہ حضرت نے ابتدا میں لکھا تھا جب کہ آپ کو اس طرف توجہ تھی اور مسائل کا جواب لکھتے تھے، اس فتوے سے میری تشفی ہوگئی اور کامل اطمینان ہوگیا۔(۱)

القول المحکم کے حوالہ سے حضرت مفکر اسلام مولانا سید محمد ولی رحمانی مدظلہ العالی کتاب کی دوسری طباعت کے پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں :

(۱) مقدمہ القول المحکم: ۸۔

یہ کتاب اصل میں ایک استفتاء کا جواب ہے، حضرت مونگیری جب کانپور رہا کرتے تھے، تو وعظ وتبلیغ، بیعت وارشاد، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ساتھ علماء اور عام مسلمانوں کے دینی سوالات کے جوابات بھی پابندی سے دیا کرتے تھے، میرا خیال یہ ہے کہ یہ جواب بھی اسی زمانے میں لکھا گیا، پھر اس کی اشاعت کا مشورہ ہوا، تو ملک کے ممتاز علماء کرام کی خدمت میں اسے مسودہ کتاب کی شکل میں بھیجا گیا اور اکثر وبیشتر حضرات نے اس کی تائید وتوثیق فرمائی؛ مگر کتاب کی اشاعت اس زمانے میں نہیں ہوسکی، حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۰۱ء میں مرشد کامل حضرت شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی نور اللہ مرقدہ کے حکم سے مونگیر کو اپنا وطن بنالیا۔(۱)

جذبۂ تحقیق ان کی درسی اور تدریسی زندگی دونوں سے عیاں ہے

حضرت مونگیریؒ اعلیٰ پایہ کے محقق بھی تھے، مسائل کی تحقیق کرکے ان کی تہہ تک اور نتیجہ تک پہنچنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا، چاہے اس کے لئے کئی دن نہ لگ جائیں، اگر متعلقہ کتابیں آپ کے پاس موجود نہ ہوتیں، تو کتابوں کی جستجو میں دور دراز مقامات کا سفر کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

آپ کے سوانح نگار حضرت مولانا محمد الحسنی تحریر فرماتے ہیں :

> مولانا کا علمی ذوق اور جذبۂ تحقیق ان کی درسی اور تدریسی زندگی دونوں سے عیاں ہے؛ چنانچہ زمانۂ طالب علمی میں مولانا سید حسین شاہ سے (جو مدرسہ فیض عام میں ان کے استاذ اور متبحر عالم تھے) بعض موضوعات پر تین تین روز تک علمی بحثیں ہوئی ہیں، بعض مسائل کی تحقیق کے لئے اکثر لکھنؤ کا سفر کرتے اور کئی کئی روز قیام کرکے علمی تشنگی بجھاتے۔

مولانا محمد سہول صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

> میں نے عمر کا اکثر حصہ علم ہی کی خدمت میں گذارا ہے اور خدا کے فضل سے طالب علمی کے زمانے ہی سے تحقیق مطالب اور تنقیح مسائل کا شوق رہا ہے، بعد ختم فقہی مسائل کی تحقیق کا شوق پیدا ہوا، اس وقت کتابیں موجود نہ تھیں، صرف تحقیق کی غرض سے لکھنؤ جاتا تھا اور دس دس پندرہ روز قیام کرکے مولوی عبدالحئیؒ صاحب مرحوم سے کتابیں لے کر دیکھتا تھا اور بعد دیکھنے کے مولوی صاحب موصوف سے گفتگو ہوتی تھی۔(۲)

---

(۱) پیش لفظ طبع دوم القول المحکم: ۴۔

(۲) مقامات، ص: ۱۴، سیرت محمد علی مونگیری، ص: ۴۸۔

مولانا لطف اللہ صاحب سے بھی مختلف مسائل پر اسی طرح علمی مذاکرہ اور مباحثہ ہوتا تھا اور جب تک تشفی نہیں ہوجاتی تھی، اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ایک مرتبہ بعض کتابوں کے لئے پٹنہ کا سفر کیا اور خدا بخش خاں اورنٹیل لائبریری میں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کیا۔(۱)

فقہ پر گہری نظر

فقہ سے مولانا کی دلچسپی کا ذکر اُوپر گذرا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے لکھنؤ کے وہ اسفار کافی شہادت ہیں، جو وقتاً فوقتاً کسی مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں کرتے تھے، اس ذوق ودلچسپی کا فائدہ یہ ہوا کہ اس شعبہ میں ان کی نظر بہت گہری اور وسیع ہوگئی، ردعیسائیت کی کوششوں کے ساتھ یہ سلسلہ بھی جاری رہا، اس درمیان میں بعض اکابر علماء کو ان سے کچھ اختلاف بھی ہوا؛ لیکن بعد میں صفائی ہوگئی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے مکہ معظّمہ سے مولانا کے نام مکتوب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں :

مکرر یہ کہ عزیزم مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہیؒ کو آپ سے رنج ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، سوا اس کے کہ اختلاف بعض مسائل کی وجہ سے آپس میں حجاب ہوگیا، جس وقت کہ بدستور سابق خط وکتابت اور آمد وشد جاری ہوجائے گی تو بالکل صفائی ہوجائے گی، مسائل میں صحابہ کرام، وائمہ مجتہدین، علماء محققین رضوان اللہ عنہم اجمعین میں بھی آپس میں اختلاف تھا؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی کو ذرہ برابر بھی کدورت نہ ہوئی۔(۲)

مولانا کی ان فقہی آراء کا اچھا خاصہ ذخیرہ تیار ہوگیا، جو کتاب المسئلہ کے نام سے خانقاہ رحمانی میں مشہور ہے۔
حضرت مولانا محمد الحسنی نے جس کتاب المسئلہ کی نشاندہی کی ہے، اس عاجز نے اس کی جستجو کی کافی کوشش کی، خانقاہ رحمانیہ کے اکابر سے بھی رابطہ کیا، ندوۃ العلماء اور دیوبند میں بھی اس کی جستجو کی گئی؛ لیکن افسوس کہ جستجو کامیاب نہ ہوسکی ورنہ حضرت کی فقاہت کے نادر نمونے اُمت کے سامنے آتے۔

میلاد کے مسئلہ پر ایک مرتبہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے گفتگو ہوئی اور مولانا نے فرمایا کہ وہ اس طرح کے میلاد کے خلاف نہیں ہیں، جس طرح کا میلاد مولانا لطف اللہ صاحب پڑھتے ہیں۔(۳)

(۱) مقالہ، ص: ۱۴، سیرت محمد علی مونگیری، ص: ۴۹۔
(۲) مقالہ متعلقہ سوانح بحوالہ الجامعہ، ص: ۲۳، سیرت، ص: ۴۹۔
(۳) سیرت محمد علی مونگیری: ۱۲۵۔

دارالافتاء کے قیام پر مولانا کی تجویز

چوں کہ حضرت کو فقہ وفتاویٰ سے غیر معمولی شغف تھا اور ابتدائی زندگی کا ایک بڑا حصہ فقہ کی غواصی اور فتاویٰ کی شناوری میں گذارا تھا، حالات حاضرہ پر گہری نظر تھی، اس لئے اُمت کو درپیش مسائل کا شرعی حل دریافت کرنے کے لئے ایک دارالافتاء کا قیام ضروری خیال کرتے تھے۔

چنانچہ مولانا محمد الحسنی روداد ندوہ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں :

> تیسری نشست میں مولانا محمد علیؒ نے یہ تجویز پیش کی کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک محکمہ افتاء قائم کیا جائے، مولانا کو اس مسئلہ سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس کو بہت ضروری اور اہم خیال کرتے تھے، انھوں نے پوری قوت کے ساتھ یہ تجویز پیش کی، مولانا عبدالحق حقانی اور شاہ سلیمان پھلوارویؒ نے اس کی تائید میں مختصر تقریریں کیں؛ لیکن دوسرے اصحاب نے فوری طور پر اس کی منظوری سے اتفاق نہیں کیا اور یہ تجویز بالآخر ایک خصوصی جلسہ کے لئے ملتوی ہوگئی۔(۱)

درالافتاء کی ضرورت پر حضرت مونگیری کی تقریر :

> یکم محرم ۱۳۱۳ھ کو جلسہ انتظامیہ میں مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بہت قوت کے ساتھ دار الافتاء کے قیام پر زور دیا (یادرہے کہ اس سے قبل اجلاس لکھنؤ میں مولانا یہ تجویز پیش کر چکے تھے) مولانا نے کہا کہ :'' ایک سال میں جس قدر شہرت آپ کے ندوۃ العلماء کو ہوئی ہے، دوسرے جلسوں کو دس پندرہ برس میں بھی نہیں ہوئی ہوگی ، پھر خاص وعام جانتے ہیں کہ علماء کی یہ انجمن ہے، اب بجز ان صاحبوں کے جو کسی خاص عالم سے خصوصیت رکھتے ہیں، تمام ہند کے مسلمانوں کی توجہ اس جلسہ کی طرف ہے، جب کوئی ضرورت انھیں پیش آئے گی اور جب کوئی مسئلہ متعلق اعتقادیات یا عملیات دریافت کرنا ہوگا تو ضرور ندوہ سے سوال کریں گے۔(۲)

---

(۱) سیرت محمد علی مونگیری:۱۲۵۔

(۲) سیرت محمد علی مونگیری:۱۴۵۔

فقہ میں اجتہاد اور وسیع النظری

اس کے بعد محکمہ افتاء کی ضرورت واہمیت پر علمی وشرعی نقطہ نظر سے مفصل تبصرہ کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ :

> جو وقت میں نے فقہ میں بیان کی ، وہ علمی حیثیت سے تھی ؛ مگر ایک اور دقت اس میں ہمارے علماء کے لئے یہ ہے کہ زمانہ کے حالات پر ان کی نظر نہیں ، دنیا کے معاملات سے اکثر ناواقف ان کی پیچیدگیوں کا سلجھانا دشوار ، جب فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ زمانے کے بدل جانے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں تو ضروری ہوا کہ مفتی زمانے کی حالت سے بھی واقف ہو اور اس طرح جب تک معاملات سے واقف نہ ہوگا اور اس کی پیچیدگیوں پر مطلع نہ ہوگا ، تو صحیح جواب کیوں کر دے گا یہاں پر محکمہ افتاء کی ضرورت دوسرے طور سے ثابت ہوتی ہے ؛ کیوں کہ بغیر اس کی خاص توجہ کے یہ مرحلہ طے نہ ہوگا اور بنظر ہماری حالت کے غیر ممکن ہے ، ہمارے علماء کو ادھر توجہ ہے نہیں کہ زمانہ کی حالت اور اس کی موجودہ اشیاء کو دریافت کریں ، جب یہ حالت ہے تو انصاف کرنا چاہیے کہ دین کی حیثیت سے اس محکمہ کی کیسی ضرورت ہے ۔(۱)
>
> اس کے بعد مولانا نے گیارہ دفعات پر مشتمل محکمہ افتاء کا ایک خاکہ پیش کیا ، جس کے مطالعہ سے مولانا کے تبحر علمی وسیع النظری اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے ، منشی اطہر علی صاحب رئیس کاکوروی نے بڑی دیر تک اور جوش کے ساتھ اس کی حمایت میں تقریر کی اور کہا کہ : ’’ پیشتر میں اس کا مخالف تھا ؛ لیکن مولانا صاحب کی تقریر نے میرا خیال بدل دیا ‘‘ آخر میں مشروط طور پر دار الافتاء کا قیام منظور ہوا ۔(۲)

علوم دینیہ ، فقہ اور کلام میں ملکہ تامہ

ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانے پر ایک دار العلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی اور مولانا نے اس کا ایک واضح خاکہ تیار کر کے ۱۲ محرم الحرام ۱۳۱۳ھ کے جلسہ انتظامی میں پیش کیا ، یہ تجویز

(۱)　کاروائی جلسہ انتظامی (قلمی) ، ص : ۱۱ ۔

(۲)　سیرت مولانا محمد علی مونگیری : ۱۴۶ ۔

منظور ہوئی اور اس کے بعد یہ خاکہ مسودہ دارالعلوم کے نام سے شائع کرکے استصواب رائے کے لئے ممتاز علماء، اکابرین اور اہل علم حضرات کو ارسال کیا گیا، اس میں دارالعلوم کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے مولانا نے دو چیزوں پر خاص زور دیا، لکھتے ہیں :

> سب سے مقدم یہ ہے کہ قوم میں ایسے علماء کی ایک جماعت موجود ہو، جو علوم مذہبی میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتی ہو، خصوصاً علم کلام میں تاکہ غیر مذہب والوں کے مقابلہ میں اسلام کی حقیقت اور عمدگی ثابت ہو سکے اور علم فقہ میں اس کو ملکہ تام حاصل ہو؛ تاکہ عبادت اور معاملات سے متعلق احکام اور فتاویٰ اس کے مستند اور واجب العمل سمجھے جائیں۔(۱)

حالات زمانہ سے واقفیت

فقہ کے اُصول میں ایک اصل عرف وعادت بھی ہے، متعدد فقہاء بالخصوص حجۃ الاسلام امام غزالی کا قول ہے: ''من لم یعرف باحوال اهل زمانه فهو جاهل''(۲) یعنی جو اپنے زمانے کے احوال نہ جانے وہ جاہل ہے، یہ اُصول حضرت مونگیری کے پیش نظر تھا، اس لئے دنیا کے حالات اور واقعات سے علماء کی واقفیت کو مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بطور خاص لازم قرار دیا، لکھتے ہیں :

> بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی، دنیا کے حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہے، اس کے اُصولِ سلطنت کیا ہیں، اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے؟ مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے؟ ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں؛ ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں اور ان کو دنیا کے حال کی بالکل خبر نہیں؛ اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل نا قابلِ التفات ہے، بے شبہ جو علماء دنیا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور ان کو کثرتِ عبادت اور ذکر وفکر کی وجہ سے اپنے

(۱) تجویز دارالعلوم: ۱۳۔

(۲) نثر الدر فی علماء القرن الرابع عشر: ۲۱۷۔

زن وفرزند کے ضروریات کی طرف بھی توجہ نہیں، اصحابِ صفہؓ سے ان کو تشبیہ دی جاسکتی ہے؛ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کل صحابہ کرامؓ اصحاب صفہ نہیں تھے اور نہ ہوسکتے تھے، بے شبہ اصحابِ صفہ سے مشابہ ایک قوم ہمیشہ دنیا میں رہنا چاہیے؛ لیکن اس کے ساتھ نہایت ضرور ہے کہ ایک جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو، جو واقفیت واطلاع، انتظام وتدبیر اور حزم ومصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حصرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ابوعبیدہ امینؓ کے نقش قدم پر ہوں۔(۱)

بعد میں پیدا ہونے والے ندوہ کے اختلافات نے مذکورہ نصب العین کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا، مولانا محمد الحسنی کے الفاظ میں: حقیقت میں یہ ایک بڑی بد قسمتی تھی اور اس اختلاف نے اس اہم دوررس نتائج کو جو مولانا محمد علی کے ذہن ونظر کی وسعت، مجتہدانہ بصیرت، منصب ارشاد وتربیت اور مولانا شبلی کی مرتبہ علمی عالی دماغ اور قوت فکریہ کے دو بازوؤں پر قائم ہورہا تھا، بہت نقصان پہنچایا، جن کی توقع اتنے طویل عرصے کے بعد ایک مؤرخ یا تذکرہ نویس کرسکتا ہے۔(۲)

’’القول المحکم‘‘ معرکۃ الآراء فقیہانہ تحریر

مذکورہ سطور سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہوتی ہے کہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ دیگر علوم وفنون کی طرح علم فقہ میں بھی یدِطولیٰ رکھتے تھے، حضرت کی ایک فقہی تصنیف اس وقت میرے سامنے ہے جس کا نام ہے ’’القول المحکم فی خطابۃ العجم‘‘ جو پہلی مرتبہ ۱۳۳۹ھ، مطابق: فروری ۱۹۲۱ء میں لالہ ٹھاکر داس کے زیر اہتمام دلی پرنٹنگ ورکس دلی سے چھپی، جب کہ دوسری مرتبہ اُردو میں جمعہ وعیدین کا خطبہ کے نام سے دار الاشاعت خانقاہ رحمانی مونگیر سے شائع ہوئی، یہ ایک شاہکار فقہی تصنیف ہے، جس میں حضرت مونگیری نے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اجماع اُمت، قیاس شرعیہ اور مصالح مرسلہ وغیرہ اُصول شریعت سے بھرپور طور پر استفادہ کیا، اس رسالہ کے معروضی جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقاصد شریعت پر بھی حضرت کی گہری نظر ہے، اور شریعت کی حکمتوں کو بھی بڑی فیاضی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، درحقیقت یہ کتاب ایک استفتاء کا جواب ہے، استفتاء یہ تھا۔

(۱)　تجویز دارالعلوم: ۱:۳۱۔

(۲)　سیرت محمد علی مونگیری: ۱۷۵۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ تمام خطبہ عربی کے سوا دوسری زبان میں پڑھنا یا خطبہ میں صرف مواعظ اور پند کو اس زبان میں بیان کر دینا، جس میں مخاطبین سمجھ سکیں، جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے، تو بلا کراہت جائز ہے یا با کراہت؟: بینوا وتوجروا!

اس سوال کا حضرت مونگیریؒ نے پہلے مختصر جواب تحریر فرمایا :

''آپ نے لکھا: ''عربی کے سوا دوسری زبان میں خطبہ پڑھنا جائز ہے، اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان کو دوسری زبانوں پر فضیلت ہے؛ اس لئے خطبہ کا عربی زبان میں پڑھنا افضل ہے ؛ مگر چوں کہ خطبہ کا اصل مقصود وعظ ونصیحت اور تعلیم و تذکیر ہے اور ہندوستان میں اس مقصد کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے، بغیر اس کے کہ اُردو وغیرہ میں بیان کیا جائے ، اس وجہ سے یہ ہونا چاہیے کہ خطبہ میں مناسب وقت ، جو وعظ ونصیحت اور تعلیم کرنا مقصود ہو، وہ اس زبان میں کی جائے جس میں حاضرین سمجھیں اور فائدہ حاصل کر سکیں اور بقیہ مضمون خطبہ کا عربی میں ہو؛ تا کہ خطبہ کا اصل مقصود فوت نہ ہو، اور حتی الوسع سلف کی پیروی اور عربی زبان کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے ، اس وقت میں اس کی زیادہ ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ مسلمانوں کو دینی اُمور کی طرف توجہ نہیں ہے، سیدھے سادھے وعظ کو ہرگز نہیں سنتے ،نماز پڑھ کر راستہ لیتے ہیں ؛ اس لئے خطبہ میں ضروری ہدایتیں حاضرین کی زبان میں کر دینا ہر طرح مناسب ہے، کئی طریقوں سے کتب فقہ وغیرہ سے اس کا ثبوت ہوتا ہے۔

مذکورہ فتوی پر دلیل کے طور پر سب سے پہلے انھوں نے امام سرخسی کی یہ عبارت پیش کی ،جس میں بہت صاف طریقہ پر اس کے جواز کی تصریح کی گئی ہے :

لو خطب بالفارسية جاز عند ابي حنيفة على كل حال وروى بشر عن ابي يوسف انه اذا خطب بالفارسية وهو يحسن العربية لا يجزيه الا ان يكون ذكر الله في ذلك بالعربية في حرف او اكثر ـ

امام سرخسیؒ کے قول سے ثابت ہوا کہ اگر خطبہ کے وعظ و پند سامعین کی زبان میں کئے جائیں اور بقیہ خطبہ عربی زبان میں ہو تو بالاتفاق جائز ہے۔

احادیث شریفہ سے استدلال

آیاتِ قرآنیہ اوراحادیث شریفہ سے بھی بھرپور استدلال کیا ہے؛ چنانچہ تحریرفرماتے ہیں: ''اب احادیث کو دیکھا جائے اس سے کیا ثابت ہوتا ہے، یعنی جناب نبی کریم ﷺ جو خطبہ پڑھتے تھے، اس میں کیا مضمون ہوتا تھا اور وہ مضمون اوراس کے الفاظ معین تھے یعنی جناب نبی کریم ﷺ ہمیشہ ایک ہی خطبہ پڑھا کرتے تھے، اوراس کا مضمون اور الفاظ مخصوص اور محفوظ تھے؟ جیسے اذکار نماز کے معین اور محفوظ ہیں، یا ایسا نہ تھا؛ بلکہ ہر موقع اور وقت کے مناسب خطبہ کا مضمون ہوتا تھا، اور ہر موقع پر نیا خطبہ اس وقت کے مناسب آپ پڑھتے تھے، حدیثوں پر نظر کرنے اور جو خطبے آپ سے منقول ہیں ؛ ان کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے خطبہ کے مضمون اور الفاظ کو معین نہیں فرمایا؛ بلکہ ہر موقع کے مناسب آپ کے خطبوں میں وعظ ونصیحت ہوتی تھی اور جس طرح اذکارِ نماز کے الفاظِ مخصوصہ پر آپ ﷺ کا اور تمام صحابہ کا عمل برابر رہا اوراس کے بعد بھی وہی الفاظ اُمت محمدیہ میں کے عمل میں رہے، خطبہ کی یہ حالت نہیں رہی، صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ :

> كان النبى صلى الله عليه وسلم يخرج يوم الفطر والاضحى الى المصلى فأول شيئ يبدأ به الصلوة ، ثم ينصرف فيقوم مقابل الناس والناس جلوس على صفوفهم فيعظهم ويوصيهم ويأمرهم الخ ـ
>
> یعنی رسول اللہ ﷺ عید اور بقرعید کے موقع پر عیدگاہ تشریف لے جاتے تھے، اور وہاں جا کر پہلے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی دوگانہ نماز ادا کرتے ، اس کے بعد نمازیوں کی طرف متوجہ ہوکر آپ وعظ فرماتے تھے، اوراور تمام نمازی صفیں باندھے اسی طرح بیٹھے رہتے تھے، آپ وعظ وپند فرماتے تھے، اوراگر اتفاقاً کہیں لشکر بھیجنا ہو تا تو وہاں جانے کا حکم فرماتے تھے یا اگر کسی اور بات کی ضرورت ہوتی تو اس کا حکم فرماتے تھے۔

اس حدیث کوذکر کرنے کے بعد حضرت مونگیری استدلال کرتے ہوئے تحریرفرماتے ہیں :

> یہ حدیث صحیحین کی ہے اس میں عیدین کے خطبہ کا ذکر ہے؛ مگر بجز وعظ وپند اوراس وقت کے مناسب ضروری باتوں کے اورکوئی مضمون خطبہ کا بیان نہیں فرمایا، اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ کا اصل مقصود وعظ وپند اورضرورت کے مناسب امرونہی

کرنا ہے؛ تاکہ حاضرین سُن کراس پر عمل کریں، یہاں اس پر نظر کرنا چاہیے کہ عام وعظ کے بعد حدیث میں یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ حاضرین کو وصیت بھی کرتے تھے، اورضروری بات کا حکم دیا کرتے تھے، اب اگر خطبہ عربی میں پڑھنا ضروری ہو، تو یہ سنت نبوی ہندوستان میں کیسے ادا کی جائے؟ اگر اس وقت کے مناسب ضروری بات عربی میں کہہ دی گئی تو کہنا بیکار رہوا؛ کیوں کہ مخاطبین اسے نہیں سمجھتے، پھر وہ عمل کیا کریں گے؛ اس لئے اس کے کہنے سے جو مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوا اورخطیب کا کہنا فضول ہوا؛ اس لئے حدیث کا مقتضا یہ ہوا کہ خطبہ پڑھنے والا مخاطبین کی زبان میں ضروری باتیں بیان کرے۔

ایک دوسری روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی نقل کرتے ہیں :

شهدت الصلاة مع النبى صلى الله عليه وسلم فى يوم عيد فبدأ بالصلوة قبل الخطبة بغير اذان ولا اقامة فلما قضى الصلوة قام متكئا على بلال ، فحمد الله واثنى عليه ، ووعظ الناس وذكرهم وحثهم على طاعة الخ ـ

یعنی میں عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے حاضر ہوا، آپ نے خطبہ سے پہلے بغیر اذان وتکبیر کے نماز شروع کی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ خطبہ پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، اور خدا کی حمد وثنا کی اورلوگوں کو وعظ ونصیحت فرمایا اور تمام حاضرین کو اللہ تعالی کی اطاعت اور پیروی پر اُبھارا، اورآمادہ کیا ۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے حضرت مونگیریؒ لکھتے ہیں: اس حدیث میں بھی وہی مضمون ہے کہ خطبہ میں آپ نے وعظ ونصیحت فرمائی، اورتمام حاضرین کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور پیروی پر اُبھارا اورآمادہ کیا، جب حدیث کے راوی آپ کے خطبہ کا مضمون اسی قدر بیان کرتے ہیں تو یہ حدیث بھی ثابت کرتی ہے کہ خطبہ کا مقصود صرف وعظ ونصیحت ہے، اورحمد وثنا اس کا پہلا جزء ہے، اس حدیث کے آخری الفاظ یعنی ''**وعظ الناس وذكر هم وحثهم**'' اس بات کو پوری طور پر ثابت کرتے ہیں کہ خطبہ میں وعظ ونصیحت ہونا چاہیے اورحاضرین کو ضروری امر کی طرف اُبھارنا چاہیے، جس سے وہ اس ضروری بات کی طرف آمادہ ہوں، اور یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی جب تک خطبہ پڑھنے والا مخاطبین کی زبان میں اپنے خطبہ میں وعظ وتذکیر نہ کرے، جسے وہ اچھی طرح سمجھتے ہوں، اس لئے اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ خطبہ کے مواعظ حاضرین کی زبان میں ہونا چاہیے۔

تیسری حدیث حضرت مونگیری نے سیدنا جابر بن عبداللہ کی پیش فرمائی، جو صحیح مسلم میں مروی ہے: ''کانت للنبی خطبتان یجلس بینھما یقرأ القرآن ویذکر الناس''(۱) یعنی رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ جمعہ میں دو خطبہ پڑھتے تھے، اور دونوں خطبوں کے درمیان آپ بیٹھتے تھے، اور خطبہ میں آپ قرآن کریم پڑھتے تھے، اور لوگوں کو وعظ نصیحت فرماتے تھے۔

اس سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ میں وعظ ونصیحت کیا کرتے تھے، اور قرآن کا پڑھنا بھی اسی غرض سے تھا اور کلام الٰہی کی تبلیغ بھی عام طور پر منظور ہوتی تھی۔

پھر خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں کہ: الحاصل ان حدیثوں سے ثابت ہوا کہ خطبہ کا مقصود وعظ اور حاضرین کے لئے تذکیر اور تبلیغ ہے، اب وہ خطبہ عید کا ہو یا جمعہ کا؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سب خطبوں میں یہی کیا کرتے تھے، آپ نے کبھی یہ نہیں کیا کہ خطبہ میں صرف اللہ کی تعریف پر قناعت کی ہو اور حاضرین کو تعلیم وتذکیر نہ فرمائی ہو، اس بیان کی توضیح ان خطبوں سے بخوبی ہوتی ہے، جو جناب رسول اللہ سے منقول ہیں، اور بعض علماء نے انھیں اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں، اور بعض خطبے علاحدہ بھی چھپے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ خطبوں میں آپ نے وعظ وپند فرمایا، اور اس کے مضامین متعین نہیں رہے، ہمیشہ نیا خطبہ پڑھا ہے، اسی طرح صحابہؓ کے خطبے بھی علاحدہ علاحدہ رہے، اور اب تک یہی حال ہے، حرمین شریفین میں جو خطیب عالم اور ادیب ہیں، اکثر نیا خطبہ پڑھتے ہیں۔

قواعد فقہیہ اور اُصول شریعت سے استدلال

اس رسالہ میں حضرت مونگیری نے اُصول اور قواعد فقہیہ سے بھی جا بجا استدلال کیا ہے، مثلاً ایک جگہ علامہ طحطاوی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ طحطاوی کے نزدیک بھی خطبہ کا پڑھنا زبان فارسی وغیرہ میں جائز ہے؛ کیوں کہ ''عدم البیان فی معرض البیان بیان''۔

اسی طرح ایک جگہ قواعد سے استنباط کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

> فقہاء اکثر مواظبت رسول ﷺ سے وجوب ثابت کرتے ہیں ؛ بشرطیکہ وہ فعل علی سبیل العبادۃ ہو اور خطبہ میں وعظ پر آنحضرت ﷺ کی مواظبت ظاہر ہے۔

مشہور فقہی قاعدہ ''ما لا یتم الواجب الا بہ'' سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ تعلیم وتذکیر کا مخاطبین کی زبان میں اسی قدر ضروری ہے، جس قدر وہ خود ضروری ہے؛ اس لئے جن انبیاء پر کتابیں نازل ہوئیں، وہ اس قوم کی زبان میں نازل ہوئیں، اسی طرح مشہور فقہی قاعدہ: ''لا ضرر ولا ضرار'' سے استدلال کرتے ہوئے

---

(۱) کتاب الجمعۃ: ۲۸۳۔

لکھتے ہیں: یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ عام تعلیم وتذکیر میں یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک مخاطب تعلیم دینے والے اور نصیحت کرنے والے کے ہر ایک جملہ کو سمجھ لے؛ کیوں کہ اس تقدیر پر تکلیف مالا یطاق لازم آتی ہے، اور "الدین یسر" کے خلاف ہوجاتا ہے؛ اس لئے کہ مخاطب مختلف زبان اور مختلف افہام کے ہوسکتے ہیں۔

مشہور فقہی قاعدہ

"تتغیر الاحکام بتغیر الزمان" سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> الغرض جب عربی خطبہ کا دوام ان مصالح پر مبنی تھا، تو محققین کو ملاحظہ کرنا چاہیے کہ یہ مصالح ہند وغیرہ میں پائے جاتے ہیں یا نہیں؛ اگر پائے جاتے ہیں، تو بلا شبہ اسی روش پر قائم رہنا چاہیے، اور اگر نہیں پائے جاتے تو خطبہ کے مقصود کو بلا بدل فوت نہیں کرنا چاہیے؛ مگر اس میں تامل نہیں ہوسکتا کہ مصالح مذکور کی بنا غلبہ اسلام اور قرب زمان رسول اللہ ﷺ ہے، اور وہ ہند وغیرہ میں مفقود ہے، پس لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ ان ممالک میں وہ مصالح نہیں پائے جاتے، جن کی وجہ سے عربی میں خطبہ پر دوام تھا۔

حضرت مونگیریؒ نے اس فتویٰ میں حدیث اور فقہ وفتاویٰ ودیگر کتابوں کے حوالہ دیئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فقہ میں کتنا رُسوخ اور آپ کا علم کتنا عمیق تھا، آپ نے اس ایک فتویٰ کے استدلال کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کی عبارتیں نقل کی ہیں اور ان کے حوالے دیئے ہیں: (۱) صحیح بخاری، (۲) صحیح مسلم، شرح صحیح مسلم از: علامہ نووی، (۳) سنن نسائی، (۴) مشکوۃ المصابیح اور اس کی شروحات، (۵) امام سرخسی کی المبسوط، اور (۶) المحیط، (۷) علامہ شرنبلالی کی نور الایضاح، (۸) مراقی الفلاح، اور (۹) اس کی شرح از علامہ طحطاوی، (۱۰) فتاوی سراجیہ، (۱۱) ہدایہ اور اس کی شروحات، فتح القدیر از علامہ ابن ہمام، عنایہ شرح ہدایہ از علامہ عینی، کفایہ، (۱۲) کنز الدقائق اور اس کی شروحات تبیین الحقائق، از: علامہ زیلعی، البحر الرائق از: علامہ ابن نجیم، اور النہر الفائق، (۱۳) مجمع الانہر، ملتقی الابحر (۱۴) الدر المختار از: علامہ حصکفی، الدر المختار از: علامہ شامی، (۱۵) احیاء العلوم از: امام غزالی، شرح احیاء العلوم از: علامہ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی، (۱۶) الوقایہ، شرح الوقایہ، (۱۷) نقایہ شرح الوقایہ از: ملا علی قاری، (۱۸) جامع الرموز از: علامہ قہستانی، (۱۹) شرح سفر السعادۃ از: شیخ عبد الحق محدث دہلوی، (۲۰) رسالہ تنبیہ الخطایا، (۲۱) فتاویٰ ہندیہ المعروف بہ فتاویٰ عالم گیریہ، (۲۲) صراط المستقیم، (۲۳) علامہ اصفہانی کی مفردات القرآن وغیر ذلک۔

ایک مختصر تحریر میں حدیث وفقہ کی درجنوں کتابوں کا حوالہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ حضرت

فقاہت وعلمیت وبصیرت کے اعلیٰ معیار پر فائز تھے، اسی لئے بڑی بصیرت کے ساتھ آپ نے اپنے موقف کو اس حد تک مدلل کر دیا کہ کسی صاحبِ علم اور اربابِ افتاء کے لئے اس سے مفر کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

ممتاز علماء ومفتیان کرام کی تصدیقات

جب یہ تحریر اس زمانہ کے ممتاز اہلِ افتاء کی خدمت میں کے ارسال کی گئی، تو ان حضرات نے اس معرکۃ الآراء تحریر کو بنظر استحسان دیکھا اور اس موقف کی تائید کرتے ہوئے اس پر اپنے تصدیقی دستخط ثبت کئے اور اپنی مہروں سے بھی اسے مزین کیا اور بعض حضرات نے اس پر مختصر یا مفصل تائیدی نوٹ بھی تحریر کئے؛ چوں کہ اس رسالے کو لکھے ہوئے ایک زمانہ گذرا، اس لئے وہ اوراق ضائع ہو گئے، بعض علماء کے جو دستخط ضائع ہونے سے محفوظ رہے، ان میں سے بعض کو نقل کیا جاتا ہے :

> ان میں سب سے اہم آپ کے استاذ گرامی قدر حضرت مولانا لطف اللہ علی گڈھی کی تصحیح ہے، حضرت مولانا علی گڈھی کی شخصیت اس زمانہ میں جامع کمالات اور مجمع برکات تھی آپ استاذ الاساتذہ تھے؛ لہٰذا ان کی تائید اس تحریر کو مزید مضبوطی فراہم کرتی ہے، اسی طرح آپ کے ممتاز ہم عصر مولانا لطف اللہ علی گڈھی کے شاگرد رشید شیخ عبدالغنی نے لکھا کہ: ''الجواب حق والحق احق بالاتباع''۔(ص:۶۰)

اس زمانہ کے مشہور فقیہ وعالم مولانا احمد حسن کانپوریؒ، مدرس مدرسہ فیض عام کانپور نے لکھا کہ :

> الجواب صحيح والمجيب نجيح وتصريحات الفقهاء بالعظة والتذكير بحيث لا يخفى تائيد صريح ، والاصرار على خلافه ليس الا التعصب القبيح ۔
>
> یعنی جواب صحیح ہے اور جواب تحریر کرنے والے نے کامیابی کے ساتھ درست جواب لکھا ہے، خطبہ کے سلسلہ میں فقہاء نے جو یہ تصریح کی ہے کہ: یہ وعظ ونصیحت ہے، اس سے اس جواب کی صراحتاً تائید ہوتی ہے؛ لہٰذا اس کے خلاف پر اصرار کرنا، یہ ہٹ دھرمی کی بدترین شکل ہے۔

اس کے بعد حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ نے ایک تفصیلی نوٹ بھی حجۃ اللہ البالغہ، قسطلانی شرح بخاری، مصفی شرح مؤطا کے حوالہ سے اُردو اور عربی میں اس فتویٰ کی تائید میں تحریر فرمایا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس وقت کانپور مدرسہ جامع العلوم میں خدمات انجام دے

رہے تھے، یہ فتویٰ آپ کی خدمت میں بھی پہنچا، تو آپ نے تصدیق دستخط ثبت کرتے ہوئے لکھا: الجواب صواب، بعد میں حضرت تھانوی نے اس نقطہ نظر سے رجوع کرلیا تھا، جس کی تفصیل امداد الفتاویٰ میں موجود ہے۔

مولانا سید احمد حسینی جو پشاور کے مشہور قاضی ومفتی تھے، انھوں نے تائید کے طور پر لکھا: المجیب مصیب، مولانا عنایت علی نے لکھا: ''اصل جواب فصل خطاب وباصواب است''، مولانا علی احمد حسینی القادریؒ نے لکھا: الجواب ھوالجواب۔

بحر العلوم محمد عباس علی خاں صدر مدرس مدرسہ محمدیہ حیدرآباد نے عربی زبان میں طویل نوٹ لکھ کر تائید کرتے ہوئے فرمایا :

> فما قال المجیب انہ الحق الیقین من سنن سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم وعلی آلہ اجمعین۔
>
> یعنی جو جواب حضرت مولانا نے لکھا ہے، وہ حق الیقین ہے اور یہی سید المرسلین ﷺ کی سنت بھی ہے۔

اسی طرح ضلع پشاور کے مشہور فقیہ مولانا سید عالم حبیب عبداللہ القرشی نے بھی تائیدی کلمات لکھے، مولانا عبدالجمیل صدر مدرس مدرسہ لطیفیہ ویلور تمل ناڈ نے تحریر فرمایا :

> فیقول العبد الذلیل المدعو بعبد الجمیل انی طالعت ھذہ الرسالۃ المؤلفۃ للعالم النحریر محرز قصبات السبق فی التقریر والتحریر المولوی الا لمعی محمد علی سلمہ اللہ العلی الکانفوری فوجدتھا صحیح المعانی سدید المبانی قمی بانامل القلب علیہ مع الاعتقاد فانہ اجاد فیما افاد جزاہ اللہ یوم التناد غب حشر الاجساد۔
>
> یعنی پر تقصیر بندہ عبدالجلیل یہ عرض کرتا ہے کہ میں نے اس رسالہ کا مطالعہ کیا ہے جو جلیل القدر عالم، تحریر وتقریر کی دنیا کے شہسوار، بابصیرت شخصیت مولانا محمد علی کانپوری حفظہ اللہ کی تصنیف ہے، میں نے اس کتاب کو صحیح مفاہیم، بنیادی اُصول کے مطابق پایا، یہ اس لائق ہے کہ اس کو اعتقاد کے ساتھ دل سے قبول کیا جائے، انھوں نے جو تحقیقات پیش کی ہیں؛ وہ بہت عمدہ اور بہتر ہیں اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

ان تمام تصدیقی دستخط اور مہر اور بلند پایہ کلمات سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت ملک کے اکابر علماء ومفتیان کرام کا حضرت مونگیری کی تحقیقات پر بڑا اعتماد تھا۔

علامہ مناظر احسن گیلانی کی تحقیق

حضرت مونگیری کی تحقیقات کو بعد کے علماء محققین نے بھی قبول کیا، ان میں ایک نمایاں نام مشہور صاحب تحقیق عالم دین، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد رشید سلطان القلم علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کا ہے۔

علامہ گیلانی فرماتے ہیں کہ یہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے اور اس میں علماء احناف میں سے کچھ کا خیال ہے کہ نمازیوں کی مادری زبان میں جمعہ کا خطبہ دینا مکروہ نہیں ہے؛ بلکہ بلا کراہت جائز ہے، اور صحیح یہی ہے اور اس پر امام ابوحنیفہؒ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا اجماع ہے۔

جو لوگ خطبہ جمعہ کا عربی کے دوسری زبان میں دینا مکروہ سمجھتے ہیں، ان کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :

> ایک زمانہ سے ہندوستان کے حنفی علماء میں یہ مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے عربی زبان کے سوا دوسری زبان میں خطبہ جمعہ غیر مسنون قرار دینے والے حضرات کے دلائل عام طور پر مشہور ہیں، غالباً ان میں سب سے قوی تر دلیل وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ نے پیش فرمائی ہے کہ غیر عربی ممالک میں حالاں کہ جمعہ و جماعت کا عہد صحابہ میں ظاہر ہے کہ ہر مفتوحہ ملک میں انتظام تھا؛ لیکن کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی، جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ان غیر عربی ممالک میں باشندوں کی رعایت سے سننے والوں کی زبان میں خطبہ ک ترجمہ کی اجازت دی گئی ہو۔(۱)

اس دلیل کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

> شہادت کا نہ ملنا اس کو وجود شہادت قرار دینا، یا کسی مباح فعل کو نہ کرنا فعل کے عدم اباحت کی دلیل کیا بن سکتی ہے؟ کتاب وسنت میں ترجمہ کی ممانعت نہیں ہے؛ اس لئے اس کو مباح سمجھنا چاہیے، صحابہؓ نے اگر کسی فعل مباح پر عمل نہ کیا تو کیا ان کا عمل نہ کرنا اس فعل کی اباحت کو کراہت سے بدل دے گا؟ نیز غیر عربی زبانوں سے عموماً صحابہ کی ناواقفیت بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے کہ ترجمہ کے فعل مباح پر وہ عمل نہ کرسکے۔(۲)

---

(۱) برہان دہلی مارچ ۱۹۴۷ء۔ (۲) برہان دہلی مارچ ۱۹۴۷۔

جواب دینے کے بعد پھر مسلک حنفی کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

> دوسرا مسئلہ قرآن کے سوا دوسرے اذکار مثلاً تکبیر، تسلیم، تشہد، درود، خطبہ وغیرہ کا کہ بجائے عربی الفاظ کے اسی مفہوم کو جو عربی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں، غیر عربی الفاظ میں ترجمہ کر کے نمازوں میں کوئی پڑھے؟ تو اس کا کیا حکم ہے، متن کنز الدقائق میں لکھا ہے: ''**او بالفارسية صح**'' یعنی عربی کے ان اذکار کو اگر کوئی فارسی میں ترجمہ کر کے پڑھے تو درست ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو عربی پر قادر ہے اور دوسرا جو عربی پر قدرت نہیں رکھتا، کیا دونوں کا ایک ہی حکم ہے، فقہی کتابوں میں ہے کہ قدرت والے کے لئے دوسری زبان میں خطبہ وغیرہ مکروہ ہے، اور جو قادر نہیں ہے، اس کے لئے غیر عربی اختیار کرنا مکروہ نہیں ہے؛ لیکن اس باب میں امام اعظمؒ اور صاحبینؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا اختلاف نقل کیا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ تو عربی پر خواہ قادر ہو، خواہ قادر نہ ہو، دونوں صورتوں میں غیر عربی کو جائز فرماتے ہیں، اور صاحبین قدرت والے کے لئے مکروہ قرار دیتے ہیں، یہاں مولانا گیلانی نے فتح المعین سے نقل کیا ہے :

> **محصله انه فى مسئلة الشروع بالفارسية ولو مع القدرة على العربية رجعا الى قوله بخلاف القراءة بها مع القدرة على العربية فانه رجع الى قولهما ۔** (۱)
>
> یعنی خلاصہ یہ ہے کہ باوجود عربی پر قادر ہونے کے فارسی زبان میں نماز کو شروع کرنا یعنی فارسی میں تکبیر کا ترجمہ کرنا اس مسئلہ میں امام ابو یوسف اور امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اختیار کر لیا ہے۔

اور قرآن کی قرأت میں امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے، جن کتابوں میں اس کے خلاف لکھا ہے، وہ اشتباہ اور نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے، اس کی صاحب فتح المعین نے صراحت کی ہے : ''**ومن ههنا حصل الاشتباه**'' اس کے نہ سمجھنے سے دوسرے مصنفین کو اشتباہ ہوا ہے، علامہ مزید لکھتے ہیں : اب میں سمجھتا ہوں کہ عربی زبان پر قادر ہونے کے باوجود قرآن کے سوا دوسرے اذکار جس میں خطبہ جمعہ بھی بالاتفاق داخل ہے، ان کے متعلق ہمارے تینوں امام یعنی مام ابوحنیفہؒ، قاضی ابو یوسفؒ اور محمد بن حسن سب ہی اس

(۱) فتح المعین: ۱۸۳۔

بات کے قائل ہیں کہ بغیر کراہت غیر عربی الفاظ میں ان کا ترجمہ جائز ہے، مبسوط کے حوالہ سے اس موقع پر فتح المعین ہی میں نقل کیا ہے: ''من غیر کراھة علی الاصح علی ما ذکرہ السرخسی'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں صاحبین کا رجحان ان اذکار کے متعلق بھی کراہت کا تھا اور امام ابوحنیفہؒ جواز کے قائل تھے؛ لیکن بعد میں دونوں صاحبان اپنے استاذ کے ہمنوا ہو گئے؛ اس لئے حنفی مذہب کا یہ اجماعی مسئلہ ہوا کہ سارے غیر قرآنی اذکار جن میں خطبہ جمعہ بھی شامل ہے، ان کا ترجمہ عربی پر قادر ہونے کے باوجود خطیب کر سکتا ہے اور کسی قسم کی کراہت اس میں نہیں ہے، تاتارخانیہ کے حوالہ کے بعد صاحب فتح المعین نے صراحت کی ہے: ''فظاھرہ کالمتن رجوعهما الیه لا هو الیهما فاحفظه فقد اشتبه علی کثیر حتی الشرنبلالی'' یعنی تاتارخانیہ کا حاصل بھی وہی ہے جو متن کنز کا ہے، غیر قرآنی اذکار میں صاحبین نے ہی امام ابوحنیفہؒ کے قول کی طرف رُجوع کیا ہے نہ کہ ابوحنیفہؒ نے صاحبین کے قول کی طرف، اس کو یاد رکھو اس لئے کہ اس مسئلہ میں اکثر کو اشتباہ ہو گیا ہے، حتیٰ کہ شرنبلالی کو بھی، مولانا گیلانی نے اس تحقیقی مضمون میں مولانا فخر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ: ''پس اگر خطبہ بلفظ ہندی درین مملکت خواندہ شود برائے چیزے موضوع است حاصل شود'' یعنی اگر خطبہ ہندی زبان میں اس ملک میں پڑھا جائے تو خطبہ کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔(۱)

حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات کے ضمن میں علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کی تحقیقات کو اس لئے تفصیل سے ذکر کیا گیا؛ تاکہ معلوم ہو سکے کہ اُردو میں جمعہ وعیدین کے جواز کا مسئلہ حضرت مونگیری کا تفرد نہیں؛ بلکہ بڑے بڑے محقق علماء بھی اس کے قائل رہے ہیں، ان سے قبل علامہ عبدالحئ لکھنوی نے بھی اُردو میں خطبہ جمعہ کے جواز کا فتوی دیا تھا۔(۲)

مکہ مکرمہ فقہ اکیڈمی کا فیصلہ

بعد میں دیگر مفتیان کرام نے بھی اسی رائے کو پسند کیا، مختلف فقہ اکیڈمیوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور اس کے مطابق فیصلہ ہوا، اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمۃ نے اپنے پانچویں اجلاس منعقدہ: ۸-۱۴/ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں یہ فیصلہ کیا کہ:

> ایک متوازن رائے جسے فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ پسند کرتی ہے یہ ہے کہ جن ممالک میں عربی زبان نہیں بولی جاتی ہے، وہاں جمعہ اور عیدین کا خطبہ عربی زبان میں دینا خطبہ کے

---

(۱) مستفاد از: حیات گیلانی مصنفہ حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی۔

(۲) مجموعۃ الفتاویٰ، فصل: ۲۵۔

صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ جولوگ عربی نہیں جانتے، انھیں خطبہ کا ابتدائی حصہ اور قرآن کریم کی آیتیں عربی زبان میں سنائی جائیں؛ تاکہ جولوگ عرب نہیں ہیں، وہ قرآن کریم اور عربی زبان سنیں، اور ان کے لئے عربی زبان سیکھنے اور قرآن مجید عربی میں پڑھنے کی راہ کھلے، پھر خطیب حاضرین کی زبان میں وعظ وتبلیغ کرے اور شریعت کے احکام پر روشنی ڈالے۔(۱)

آپ کی فقاہت ومعاملہ فہمی اس وقت کے اہل علم میں کس حد تک مسلم تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے جب ارباب حل عقد کو امارت شرعیہ کی ضرورت کے سلسلہ میں جوڑنا چاہا، تو ایک سوال امیر شریعت کے انتخاب اور اس کے لئے مطلوبہ صفات کا سامنے آیا، تاریخ امارت شرعیہ میں ہے: اِس زمانے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے امراء کی تلاش اور حضرت امام اعظم اور حضرت امام مالکؒ جیسے ائمہ کی جستجو کام نہ کرنے کا ایک بہانہ بن سکتی ہے؛ لیکن وجوب کے ساقط ہونے کا ذریعہ نہیں بن سکتی؛ تو پھر اس زمانے میں آخر امیر کے لئے کیا شرطیں ہونی چاہیے، حضرت سجاد نے اس کا جواب یہ دیا کہ چوں کہ امارت شرعیہ کے کام سیاسی اور شرعی دونوں ہوں گے؛ اس لئے ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے میرے نزدیک جن شرائط کے ساتھ امیر کا انتخاب ہونا چاہیے وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) امیر شریعت عالم باعمل صاحبِ فتوی اور علماء کے طبقہ میں اپنی علمی حیثیت سے ایک حد تک وقار رکھتا ہو، مشائخ طریقت میں صاحب وجاہت ہو، اور صوبہ کے اندر اپنا ایک حلقہ رکھتا ہو، اور مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت اس سے متعلق ہو کہ تنظیم شرعی اور اجتماعی قوت جلد از جلد پیدا ہو سکے۔

(۲) صاحبِ بصیرت، حق گو حق بیں، اور بے باک ہو، کبھی مادی طاقت سے بظاہر مرعوب نہ ہونے والا ہو۔

(۳) مسائل حاضرہ میں بھی ایک حد تک بصیرت کے ساتھ رائے دے سکتا ہو اور حسن تدبیر کے ساتھ کام کرسکتا ہو، لاپرواہی اور خودرائی کے مرض سے پاک ہو۔

آپ علمیت وفقاہت پر حضرت امیر شریعت اول کی شہادت

ان تینوں شرائط میں سب سے اول شرط ہے عالم باعمل صاحب فتوی ہونا اور اپنی علمی حیثیت سے باوقار ہونا،

(۱) مکہ فقہ اکیڈمی کے فقہی فیصلے، ص: ۱۰۷، ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی، طبع دوم: ۲۰۰۲ء۔

اس کے بعد دیگر اوصاف ہیں؛ آپ غور فرمائیں کہ اس وقت بہار میں دو خانقاہیں مرجع خواص وعوام تھیں، ان میں سے ایک بہار کے دار الحکومت پھلواری شریف، پٹنہ میں خانقاہ مجیبیہ جہاں زبدۃ السالکین اور بدر الکاملین حضرت شاہ بدالدین قادری صاحب سجادہ تھے، اور دوسری خانقاہ رحمانیہ مونگیر جہاں ہمارے ممدوح حضرت مونگیری منبع رشد وہدایت بنے ہوئے تھے، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے مذکورہ مکتوب کے جواب میں حضرت شاہ بدرالدین قادری (امیر شریعت اول) نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، آپ نے لکھا :

> محکمہ شرعیہ کے امیر کے لئے میری رائے میں جو پانچ صفات ہونی بتائی گئی ہیں؛ بہت مناسب ہیں، اس صوبہ بہار میں ان صفات سے موصوف اس وقت جناب مولانا شاہ محمد علی رحمانی کے سوا دوسرے کو نہیں پاتا، اس لئے میری رائے ہے کہ اس منصب پر وہی مقرر کئے جائیں اگر علالت مزاج کے عذر سے وہ تشریف نہ لائے ہوں تو ان کا موجود رہنا، اس جلسہ میں ضروری نہیں ہے، ان کے منتخب ہونے کے بعد کوئی ان کی نیابت کرے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ان کی اطاعت کا اقرار لے لے۔(۱)

اس گراں قدر جوابی مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے علم، فقاہت، معاملہ فہمی اور دور اندیشی کا سکہ رائج الوقت چلتا تھا، جس کی گواہی ایک عظیم علمی وروحانی ہستی نے دی ہے۔

> امارت شرعیہ کے قیام کے لئے پتھر کی مسجد میں پہلے اجلاس میں آپ خود تو بوجہ علالت حاضر نہ ہو سکے؛ البتہ اپنے نواسہ کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔(۲)

اور وعدہ کیا کہ آئندہ اجلاس کے موقع پر امارت شرعیہ کی شرعی وفقہی حیثیت پر ایک تفصیلی مقالہ ارسال کروں گا؛ چنانچہ آپ نے حسبِ وعدہ امارت شرعیہ کی شرعی وفقہی حیثیت پر ایک مفصل ومبسوط تحقیقی مقالہ تحریر فرمایا: ۹ر ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کو امیر شریعت دوم حضرت مولانا شاہ محی الدین قادری کے انتخاب کے لئے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ میں اجلاس منعقد ہوا تھا، یہ اجلاس آپ کی صدارت میں منعقد ہونے والا تھا؛ لیکن علالت شدیدہ کی وجہ سے آپ کو عین وقت پر سفر ملتوی کرنا پڑا اور اپنے صاحب زادے حضرت شاہ لطف اللہؒ کو اپنا نائب بنا کر بھیجا، جنھوں نے حضرت مونگیری کی نیابت میں اجلاس کی صدارت بھی کی اور حضرت مونگیری کے تحریر کردہ

---

(۱) تاریخ امارت شرعیہ: ۷۳۔

(۲) تاریخ امارت: ۷۳۔

خطبہ صدارت کو بھی پیش فرمایا، جیسا کہ کہ تاریخ امارت کے مطالعہ سے واضح ہے؛ لیکن افسوس کے باوجود تلاش کہ وہ مقالہ دستیاب نہیں ہوسکا، (۱) ورنہ حضرت کی فقہی بصیرت کے نئے نقوش سامنے آسکتے تھے؛ لیکن جو کچھ بھی سامنے ہے وہ حضرت کی فقہی خدمات کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی فقہی خدمات کے حوالہ سے گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا؛ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ حضرت ایک بلند پایہ فقیہ اور بابصیرت مفتی بھی تھے، ایک مفتی کے طور پر اپنی ابتدائی عملی زندگی کی شروعات کی، پھر جب ندوۃ العلماء کی تحریک آپ نے شروع کی تو وہاں دارالافتاء قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا اور آپ کی تحریک وتجویز پر ندوۃ العلماء میں دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا، اور آپ کی نگرانی میں یہ سفر جاری رہا اور اُمت آپ کی فقہی خدمات سے مستفید ہوتی رہی، جب آپ اپنے پیر ومرشد کے حکم پر مونگیر تشریف لائے تو تحفظ ختم نبوت اور تحفظ شریعت کا عظیم کارنامہ آپ کے ذریعہ انجام پایا، اس درمیان آپ کی فقہی صلاحیتیں بھی اُجاگر ہوتی رہیں، اور ملت اسلامیہ کو آپ اپنی فقہی خدمات سے بھی فیض یاب کرتے رہے، جزاہ اللہ تعالیٰ عن المسلمین خیر الجزاء۔

• • •

(۱) حضرت مونگیریؒ کا خطبہ صدارت امارت شرعیہ سے طبع ہو چکا ہے اور دستیاب ہے۔

ایشیاء کے دل میں چند دن!

خالدسیف اللہ رحمانی

جنوبی ایشیاء کا ایک اہم ملک افغانستان ہے، جس کو علامہ اقبالؔ نے ایشیاء کا دل کہا ہے اور کہا ہے کہ اس کے فساد سے پورے ایشیاء کا فساد اور اس کے امن سے پورے ایشیاء کا امن متعلق ہے :

آسیا یک پیکرِ آب و گل است　　　ملتِ افغان در آں پیکرِ دل است
از فساد اُو فسادِ آسیا　　　در گشاد اُو گشاد آسیا

چھٹی صدی قبل مسیح تک یہ ایران میں شامل تھا، ۳۳۰ ق م میں اس کو سکندر اعظم نے فتح کیا، اس کے بعد سے یہ ہمیشہ طالع آزما فرماں رواؤں کا میدان کارزار رہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں احنف بن قیسؓ نے ایران کے بادشاہ یزدگرد کو شکست دے کر خراسان کو فتح کرلیا، جو ایران سے متصل علاقہ ہے، یہ ہجرت کے تیسرے سال بصرہ میں پیدا ہوئے، یعنی حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہی ان کی ولادت ہوئی ؛ لیکن آپ کی صحبت نہیں پا سکے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے اور پھر بصرہ لوٹ گئے، جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھے، قبیلۂ تمیم کے سردار اور اپنے قبیلہ میں بے حد مقبول تھے، ان کی حلم و بردباری کی مثال دی جاتی تھی، ۷۲ھ میں کوفہ میں وفات ہوئی، پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں عبداللہ بن عامرؓ نے کابل کو فتح کیا، اس وقت تک افغانستان میں تین مذاہب فروکش تھے، زرتشت، بودھ اور ہندو (جو اس زمانے میں برہمن کہلاتے تھے) فتح کابل کے بعد یہاں اسلام کی دعوت اور اشاعت کا بھی کام ہوا، اور پچاس ہزار سے زیادہ عرب بھی یہاں آباد کئے گئے، یہ پورا ملک پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے، کابل اور ہرات کے درمیان ہوائی جہاز سے گزرتے ہوئے دُور دُور تک پہاڑ ہی نظر آرہے تھے، اور بہت سی پہاڑی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی، اس ملک کی سرحدیں ایران، پاکستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان اور چین سے ملتی ہیں ؛ اگرچہ اس کو ساحل سمندر حاصل نہیں ہے ؛ لیکن اس کے پہاڑوں پر برف جمنے کی وجہ سے پانی کے اعتبار سے یہ بہت مال دار ملک ہے، جو نہ صرف اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے ؛ بلکہ پاکستان، ایران اور تاجکستان کو بھی وافر مقدار میں یہاں کے دریاؤں کا پانی حاصل ہوتا ہے۔

اس ملک نے اسلامی علوم، ادب اور تصوف میں بڑی بڑی شخصیتیں عطا کی ہیں، جن کا نام پوری دنیا میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے، جیسے امام ابوحنیفہ کے دادا زوما، ابراھیم بن ادھمؒ (متوفی: ۱۶۱ھ)، مشہور محدث ابوداؤد سجستانیؒ (۲۰۴-۲۷۵ھ)، معروف ریاضی داں اور ماہر فلکیات ابوالمعاشر بلخیؒ (۷۸۷-۸۸۶ھ)، ابراھیم بن طہان ہرویؒ (متوفی: ۱۶۸ھ) علم حدیث میں جن کا مقام اتنا بلند تھا کہ امام احمد بن حنبلؒ ٹیک لگائے ہوئے تھے، جب ان کے سامنے آپ کا ذکر آیا تو از راہ ادب بیٹھ گئے، ابوریحان البیرونی (۲۱۳-۲۷۶ھ)، معروف فلسفی اور سائنس داں ابن سینا کے والد، مشہور صوفی ابوالحسن فردوسی طوسی (۳۳۹-۴۱۶ھ)، مولانا رومؒ، مولود بلخ، (۶۰۴-۶۷۲ھ) مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ، مشہور مفسر امام فخر الدین رازیؒ اور کن کن کا نام لیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے مختلف شہر کابل، ہرات اور اس سے متصل ایران، تاجکستان اور ازبکستان وغیرہ کے علاقے دنیائے عجم کے بغداد کی حیثیت رکھتے تھے، جہاں سے بڑے بڑے محدثین اور فقہاء پیدا ہوئے۔

یہ وہ عظیم نسبتیں ہیں جن کی وجہ سے ایک زمانہ سے اس علاقے کے سفر کی آرزو تھی؛ لیکن وہاں کے سیاسی نشیب وفراز کی وجہ سے ہمت نہ ہوتی تھی، ادھر دو سال سے ایک مخلص عزیز مولانا محمد یونس سادات اور افغانستان کے دوسرے علماء وہاں کے سفر کی دعوت دے رہے تھے، رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ سے پہلے پیش کش کی گئی کہ عید کے چند ہی روز بعد یہاں کا سفر ہو، میں نے بھی ابتداءً مناسب وقت ہونے کی وجہ سے اسے منظور کرلیا تھا؛ لیکن پھر اپنی علالت کی وجہ سے معذرت کردی، پھر میزبان نے میری سہولت کے لحاظ سے پروگرام کو مؤخر کیا، اس طرح اس پُرسعادت دعوت کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا؛ چنانچہ راقم الحروف اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے شعبۂ علمی کے رفیق مولانا امتیاز احمد قاسمی سلمہ کے ساتھ ۲۵/جون ۲۰۱۹ء کو ۳/بجے دن کام ایئر لائز کے ذریعہ دہلی ایئر پورٹ سے نکلے اور افغانستان کے وقت کے لحاظ سے ۷/بجے احمد کرزئی ایئر پورٹ کابل پہنچ گئے، جب ہم لوگ دہلی سے چلے تو سخت گرمی تھی اور جھلسا دینے والی ہوا چل رہی تھی؛ لیکن جوں ہی کابل ایئر پورٹ پر پہنچے، خوش گوار بادِ نسیم نے استقبال کیا۔

کابل کے خوش گوار موسم کا بہترین نقشہ شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے کھینچا ہے، جن میں سے چند اشعار اس طرح ہیں :

شہر کابل خطۂ جنت نظیر — آبِ حیواں از رگ تاکش بگیر
آں دیار خوش سواد، آں پاک بوم — بادِ اُو خوشتر زبادِ شام و روم
آبِ اُو براق و خاکش تابناک — زندہ از موجِ نسیمش مردہ خاک

شہر کابل جنت نظیر خطہ ہے، اس کے انگور کی رگوں سے آبِ حیات جاری ہوتا ہے، یہ
بہترین منظر اور پاکیزہ موسم کا علاقہ ہے، اس کی ہوا شام وروم کی ہوا سے بھی بہتر ہے،
اس کا پانی خوب روشن اور اس کی مٹی تاب ناک ہے، اس کی بادِ نسیم کے جھونکے سے
مردہ مٹی زندہ ہوجاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے کابل کے موسم اور ماحول کے بارے میں ان اشعار میں جو بات کہی ہے، وہ آج بھی وہاں سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، علامہ اقبالؒ نے افغانیوں کے بارے میں کہا ہے کہ وہ بہت ہی سیر چشم واقع ہوئے ہیں، خوبصورت لعل و گہر کی طرح ہیں، ان کی مثال اس تیغ کی ہے، جو خود اپنے جوہر سے بے خبر ہوتا ہے :

ساکنا نش سیر چشم وخوش گہر
مثل تیغ از جوہرِ خود بے خبر

واقعی افغانستان اور اہل افغانستان اس کا مصداق ہیں۔

چوں کہ افغانستان کی جنگ میں یہ ائیر پورٹ بھی تباہ ہوگیا تھا؛ اس لئے اس کی تعمیری کام چلاؤ حالت میں ہے، رن وے اور بلڈنگ دوسرے ملکوں کے اعتبار سے معمولی ہے، چھتیں ٹین شیڈ کی ہیں، جن کے نیچے سیلنگ بھی نہیں کی گئی ہے، وسعت بھی کم ہے، اور مطلوبہ سہولتیں یا تو کم ہیں یا نہیں ہیں، سولار کی لائٹ کا انتظام ہے، شاید اسی وجہ سے روشنی بھی مدھم ہے، مسافروں کی کئی مرحلوں میں چیکنگ ہوتی ہے اور سامان کا بھی بار بار جائزہ لیا جاتا ہے، ہم لوگوں کے سامان میں کچھ کتابیں بھی تھیں، ائیر پورٹ کے عملے نے اس کو اتنی اہمیت کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی کہ گویا بم اور بارود رکھا ہوا ہو؛ لیکن ان سب کے باوجود جہاز سے لے کر ائیر پورٹ تک افغانی عملہ بہت با اخلاق اور شریف نظر آئے، چاہے ایمیگریشن آفیسر ہوں یا کسٹم افسر، یا پولیس اور فورس کے ارکان، سبھی لوگ مسافرین کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں، اور ہم جیسے لوگ جن کی ظاہری وضع قطع دین داروں کی سی ہے، سے تو بہت ہی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

جوں ہی ہم لوگ کسٹم ہال سے باہر نکلے، میز بانوں کی ایک جماعت باہر موجود تھی، مولانا محمد ابراہیم صاحب ، مولانا محمد اسحاق، مولانا محمد یونس، مفتی نثار احمد، حاجی امجد بہار، جناب عبدالقیوم انجینئر وغیرہ، ہم لوگ دو گاڑیوں میں سوار ہوکر نکلے، کابل میں سرِ شام ہی دُکانیں بند ہوجاتی ہیں؛ اس لئے سڑکوں پر اژدہام کم ہوگیا تھا، ۳۰ / ۴۰ منٹ میں ہم لوگ دارالعلوم نعمانیہ پہنچ گئے، یہیں ''مجمع الفقہ الاسلامی افغانستان'' کا تیسرا سیمینار تھا، جو اگلے دن ظہر بعد ہونا تھا، اسی کے مہمان خانہ میں قیام کا انتظام کیا گیا تھا، مولانا محمد یونس سادات نے ہماری راحت کے لئے کوشش کی کہ

زیادہ لوگوں کو اس کی اطلاع نہ کی جائے، پھر بھی دو چار حضرات ملاقات کے لئے آ گئے، اور ہم لوگ رات کے بارہ بجے ہی بستر پر جا سکے، مولانا بشیر الدین صاحب جو دار العلوم زاہدان کے فارغ ہیں، اُردو کم بولتے ہیں؛ لیکن ماشاء اللہ عربی زبان پر بہت اچھی قدرت رکھتے ہی، اور فارسی اور پشتو توان کی مادری زبان ہے، وہ شروع ہی سے راحت پہنچانے میں لگے رہے، اور ہر طرح آرام کا خیال رکھا، ماشاء اللہ یہ ذہین نوجوان ہیں، انہوں نے دار العلوم زاہدان میں تخصص کے لئے تعدد ازدواج کے موضوع پر اپنا مقالہ لکھا ہے، ماشاء اللہ اچھا مقالہ ہے، ان کی خواہش پر میں نے اِس کتاب کے لئے تقریظ بھی تحریر کی۔

دار العلوم نعمانیہ کی بنیاد ۱۴۳۴ھ میں رکھی گئی، مولانا سید محمد رفیق صاحب اس کے بانی اور نگران اعلیٰ ہیں، عمر ۸۰ رسال سے متجاوز ہے، کھلا ہوا رنگ، سفید اور گھنی داڑھی، سر پر عمامہ اور ہاتھوں میں عصا، کمر جھکی ہوئی، خلیق اور شفیق، چہرے سے لے کر لباس تک گویا نور میں نہلایا ہوا وجود، باوجود ضعف کے تشریف لائے، ملاقات کی، دُعائیں دیں، اور اپنے لئے دُعاء کی خواہش کی، دار العلوم کے مہتمم مولانا سید محمد ابراہیم صاحب ہیں، جو افغانستان کی تبلیغی جماعت کی شوریٰ کے رکن ہیں، اور بہت ہی مرنجا مرنج شخصیت کے مالک ہیں، مفتی محمد اسحاق صاحب ناظم تعلیمات ہیں، کم گو اور متواضع آدمی ہیں، انہوں نے کئی اہم اُردو کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے، ان کی خواہش پر میں نے ان کی ایک کتاب کے لئے تقریظ بھی لکھائی، اچھا قلمی ذوق رکھتے ہیں، مولانا محمد یونس صاحب شعبۂ افتاء کے ذمہ دار ہیں، ان کی فراغت بھی دار العلوم زاہدان سے ہے، نوجوان ہیں اور جدوجہد کا جذبہ رکھتے ہیں، انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا، تمام علمی مراکز پر پہنچے، وہاں کے بزرگوں سے ملاقاتیں کی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا بھی آئے اور بار بار آئے، یہاں کے طریق کار کو دیکھا، سیمینار میں شرکت کی اور اس کے گہرے نقوش لے کر افغانستان گئے، پھر وہاں اسی نہج پر اپنے بزرگوں کے مشورے سے اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے مجمع الفقہ الاسلامی افغانستان کی بنیاد رکھی، ابھی یہ ادارہ ابتدائی مرحلہ میں ہے؛ لیکن اس کے ذمہ داروں اور کارکنوں کی صلاحیت اور جذبۂ جدوجہد کو دیکھتے ہوئے اُمید ہے کہ بہت جلد یہ چھوٹا سا پودا ایک تناور درخت بن کر اُبھرے گا۔

اگلے دن ۲۶ رجون ۲۰۱۹ء کو نماز ظہر کے بعد سیمینار کی افتتاحی مجلس منعقد ہونے والی تھی اور ظہر تک کا وقت خالی تھا، رات کو یہ طے ہوا تھا کہ اس وقت کو شہر کے اہم مقامات کے دیکھنے میں گزارا جائے؛ چنانچہ صبح کے ناشتے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ سے نکلے اور سب سے پہلے شہدائے صالحین نامی محلہ میں پہنچے، یہ ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے، جس پر کافی دُور تک دو دیواریں بنی ہوئی ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس وقت پہاڑ کے اوپر کھینچی گئی یہ دیواریں سرحدیں تھیں، جن کی ایک طرف بت پرستوں کی حکومت تھی اور دوسری طرف آتش پرستوں کی، اسی پہاڑ کے دامن

میں ایک مدفن ہے، جس میں اجتماعی قبر ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں ۲۷ رقبریں ہیں، ان کے نام کا کتبہ بھی باہر لگا ہوا ہے، جس میں بعض صحابہ، بعض تابعین اور صحابہ کی اولاد ہیں، یہ حضرات فتح کابل کے جہاد میں شامل تھے اور انھوں نے اس دیار میں اسلام کی دعوت کا کام بھی کیا تھا، یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک اور مقبرہ ہے جس میں حضرت تمیم انصاری اور جبیر انصاری کی قبریں ہیں، یہ اس لشکر میں شامل تھے، جو ۲۸ رتا ۳۰ رھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہدایت پر حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حبیب قریشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایران سے یہاں وارد ہوا، اس وقت یہاں کا بادشاہ اِعراج شاہ تھا، جو لشکر اسلامی کے مقابلہ میں مغلوب ہوا، اور مشرف بہ اسلام ہوگیا، کتبِ رجال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ فتح مکہ کے موقع سے مسلمان ہوئے اور ان ہی کے ہاتھوں سجستان اور کابل کا علاقہ فتح ہوا، وہ خود تو ایران کی طرف واپس ہوگئے؛ لیکن ان دونوں انصاری صحابہ کو کابل ہی میں چھوڑ گئے؛ تاکہ وہ یہاں اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیں، ناموں کی بعض تفصیلات اس مقبرہ کے ایک کتبہ پر لکھی ہوئی ہیں، یہ علاقہ ہرا بھرا ہے اور کچھ بلندی پر پانی کا چشمہ بھی ہے؛ مگر میں اپنی صحت کی وجہ سے وہاں تک نہیں جاسکا، یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کے سامنے جو آبادی ہے وہ نہایت ہی غربت وافلاس کی حالت میں ہے، مٹی کی کچی دیواریں ہیں، ٹین کا چھپر ہے، گھروں میں لکڑی کے دروازے بھی نہیں ہیں، صرف پردہ لٹکا دیا گیا ہے، مسلسل جنگ کی وجہ سے آبادی کا ایک اچھا خاصا حصہ اسی صورت حال سے گزر رہا ہے، اللہ تعالیٰ خیر کا معاملہ فرمائے۔

یہاں سے نکل کر ہم لوگ جامعہ قاسمیہ پہنچے، یہ محلہ شور بازار میں واقع ہے، اس ادارے کے دونوں طرف مندر اور گردوارے ہیں، اور محلے کے اندر بھی ہندو اور سکھ بھائیوں کی اچھی خاصی آبادی نظر آتی ہے؛ لیکن کہیں کوئی خوف ودہشت اور نفرت کا ماحول نہیں ہے، بالکل برادرانہ ماحول میں تمام مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں، اس سے بڑی مسرت ہوئی، اور اندازہ ہوا کہ میڈیا کے لوگ جو کچھ کہتے ہیں، وہ زیادہ تر جھوٹ پر مبنی ہے، جامعہ میں لوگ پہلے سے سراپا انتظار تھے اور اساتذہ اور طلبہ لائن بنا کر اپنے اس حقیر بھائی کے استقبال کے لئے کھڑے تھے، اس ادارے کے مہتمم حضرت مولانا حبیب اللہ حقانی ہیں، جو پاکستان کے شہر پشاور کے رہنے والے ہیں، انھوں نے ہی اس ادارے کی تجدید کی ہے، وہ بیمار ہونے کی وجہ سے اپنے وطن ہی میں مقیم ہیں، یہاں ان کے نائب قاری اجمل طیب صاحب انتظامی اُمور کو انجام دیتے ہیں، جو نوجوان فاضل ہیں، یہ چوں کہ سفر پر تھے؛ اس لئے ان سے ملاقات نہیں ہوسکی؛ لیکن واپسی میں انھوں نے قیام گاہ پہنچ کر ملاقات کی، اور جب ہندوستان واپسی کے لئے ہم لوگ ائیر پورٹ گئے تو ائیر پورٹ پہنچانے میں بھی ساتھ ساتھ رہے، اس ادارے کے سینئر استاذ اور تربیت افتاء کے

ذمہ دار حضرت مولانا عبدالمنان قاسمی زیدمجدہٗ ہیں، جو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار میں تشریف لا چکے ہیں، وہی ادارہ میں حاضری کے محرک تھے، وہ ایک متواضع، منکسر المزاج اور وسیع النظر عالم دین ہیں، اور دار العلوم دیوبند سے عشق کے درجہ میں محبت رکھتے ہیں، میرے ساتھ بھی ان کی غیر معمولی شفقتیں شریک حال رہیں، فجزاہ اللہ خیر الجزاء، یہاں عربی کی متوسطات تک جماعتیں تو پہلے سے قائم ہیں، اس سال تخصص فی الفقہ کا شعبہ قائم ہوا ہے، اسی کے افتتاح کے لئے اس حقیر کو مدعو کیا گیا تھا۔

راقم نے طلبہ کو درمختار کے مقدمہ کی ابتدائی سطروں کی عبارت خوانی کروائی اور علوم اسلامی میں فقہ کی اہمیت، ضرورت، جامعیت اور اس میں پائے جانے والے توازن و اعتدال پر گفتگو کی گئی، اس ادارے کے اصل بانی مشہور مصنف اور عالم معقولات میر زاہد ھرویؒ ہیں، اُن کی پیدائش ہندوستان ہی کی ہے، وہ شاہ جہاں کے عہد میں وقائع نویس اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں فوجیوں کے محتسب تھے، ۱۱۰۰ھ میں کابل میں وفات پائی، ان کی کتاب حاشیہ میر زاہد عرصہ تک ہندوستان کے مدارس میں داخل نصاب تھی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اسی درسگاہ میں ملا میر زاہد سے کسب فیض کیا تھا، یہ ایک قدیم اور وسیع مسجد میں واقع ہے، طویل عرصہ سے یہ مدرسہ بالکل ویران تھا، اب آہستہ آہستہ اس کی رونق بحال ہو رہی ہے، یہیں سے قریب مسجد ملا محمود ہے، جس میں تحریک آزادی کے دوران مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے سات سال قیام کیا تھا، وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی ہدایت پر افغانستان کے فرماں روا امان اللہ خان سے ملنے آئے تھے، اور کابل میں مقیم ہو کر آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔

آج بعد نماز ظہر دار العلوم نعمانیہ میں مجمع الفقہ الاسلامی افغانستان کی افتتاحی نشست تھی، جس میں تلاوت کے بعد مفتی محمد اسحاق سادات (ناظم تعلیمات دار العلوم نعمانیہ) نے فارسی میں اور مفتی عبدالحق حقانی (استاذ دار العلوم افغان) نے پشتو میں استقبالیہ کلمات پیش کئے، یہ دونوں یہاں کی سرکاری اور عوامی زبانیں ہیں، مولانا عبدالحق حبیبی نے افتتاحی کلمات کہے اور معلن کے فرائض انجام دیئے، مفتی نور آغا استاذ جامعہ قاسمیہ کابل نے اس حقیر کا تعارف کرایا، بلخ کے ممتاز عالم مفتی عبدالحفیظ قریشی اور دار العلوم فراہ کے مفتی آقا محمد نے تأثرات پیش کئے، اور اخیر میں اس حقیر نے اپنی معروضات پیش کیں، خاص طور پر یہ بات عرض کی گئی کہ نئے مسائل کیوں کر پیدا ہوتے ہیں، ان کے حل کے لئے فقہاء نے کیا اُصول متعین کئے ہیں، اور قرآن وحدیث سے ہمیں اس سلسلہ میں کیا روشنی ملتی ہے؟ ہر زمانے کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں، بعض ادارے موجودہ دور کی ضرورت ہے، جیسے بینکنگ نظام، انشورنس کا نظام، اسٹاک ایکسچینج، پہلے زمانے میں معاشی نظام کا دائرہ محدود تھا، تیز رفتار لیکن پُرخطر ٹکنالوجی کا استعمال

نہیں تھا، کاروباری پروجیکٹ چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے، ان اداروں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی؛ لیکن آج کی صورت حال پہلے سے مختلف ہے، اب اگر ہم صرف اس قدر کہہ دیں کہ یہ ناجائز ہے اور اس میں فلاں خرابی ہے، تو یہ بات درست نہیں ہوگی؛ بلکہ ہمیں اس کا حل اور اس کا جائز متبادل پیش کرنا ضروری ہے، نیز اس کے ذیل میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا تعارف کرایا گیا۔

دوسری نشست مغرب تا عشاء منعقد ہوئی اور عشاء کی نماز تاخیر سے ادا کی گئی، اس سیمینار کا مرکزی موضوع بیع وفا اور مال مرہون سے استفادہ تھا، اس سلسلہ میں چھ سوالات کئے گئے تھے، جو مقالات آئے تھے ہر سوال نمبر کے لحاظ سے ایک ایک فاضل نے فارسی زبان میں جوابات کی تلخیص پیش کی، اس کے بعد مرحلہ تھا تمام مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے عرض مسئلہ پیش کرنے کا، جس میں کسی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے، پھر اس پر بحث کی جاتی ہے: چنانچہ ایک فاضل نے فارسی میں اور ایک نے پشتو زبان میں عرض مسئلہ پیش کیا، اس کے بعد مختصر مناقشہ و مذاکرہ ہوا، جس میں کچھ سوالات اُٹھائے گئے، حاضرین کے اصرار پر اس موضوع سے متعلق میرے مقالہ کا خلاصہ مولانا امتیاز احمد قاسمی رفیق شعبۂ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے پڑھ کر سنایا اور اس کے بعد اس حقیر نے مختصر گفتگو کی، جس کا حاصل یہ تھا کہ احکام شریعت میں دونوں باتوں کی اہمیت ہوتی ہے، ایک: کسی عمل کی شکل و ہیئت، دوسرے: اس کے مقاصد، خرید وفروخت کی یہ صورت کہ کوئی چیز اس شرط پر بیچی جائے کہ خریدار اس سے فائدہ اُٹھائے اور جب بیچنے والے کو اتنی رقم مہیا ہو جائے تو اسے واپس خرید کر لیا جائے، شکل کے اعتبار سے خرید وفروخت کی ایک صورت ہے، اس لحاظ سے اسے جائز ہونا چاہئے؛ لیکن مقصد اس کا یہ ہے کہ چوں کہ قرض دے کر اس پر نفع لینا سود ہے؛ اس لئے اس کو بہ ظاہر تجارت کی شکل دی جائے، پیسہ دینے والا اس شئے سے فائدہ اُٹھالے اور پیسہ لینے والا بعد میں پورے پیسے واپس کر کے سامان واپس لے لے، انھیں دونوعیتوں کی وجہ سے حکم متعین کرنے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے؛ البتہ معاملات میں زیادہ اہمیت مقاصد کی ہوتی ہے، آپ اس کی روشنی میں غور فرما سکتے ہیں، بہر حال اخیر میں تجویز کمیٹی کا اعلان ہوا اور دُعاء پر مجلس ختم ہوئی۔

اگلے دن ۲۷ رجون کو صبح تا نماز ظہر سیمینار کی آخری نشست ہوئی، جس میں کابل اور افغانستان کے چار زون کے نمائندوں نے اپنے اپنے علاقہ میں دارالافتاء کے کاموں کی رپورٹ پیش کی، یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہر علاقہ میں علماء اہم فقہی مسائل کے بارے میں اجتماعی طور پر غور وخوض کرتے ہیں، کاش! ہندوستان میں بھی اس کی کوئی صورت پیدا ہو، پھر چند حضرات نے تأثرات پیش کئے، اس کے بعد تجویز کمیٹی کی مرتب کردہ تجاویز پیش کی گئیں، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ اور ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے اس مسئلہ پر

جو فیصلے کئے ہیں، بالآخر اسی کے قریب تمام لوگوں کا اتفاق ہوا، سیمینار کا فیصلہ چھ تجاویز اور ہدایات پر مشتمل ہے، جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مالِ مرہون سے نفع اُٹھانا جائز نہیں ہے، نہ ہیوی ڈپازٹ اور معمولی کرایہ جائز ہے؛ البتہ فقہاء نے بیع وفا کے درست ہونے کے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں، ان کی رعایت کے ساتھ بیع وفا جائز ہے، یہ آخر الذکر نکتہ دوسری اکیڈمیوں کے فیصلے سے کسی قدر مختلف ہے اور وہاں کے عرف ورواج کے پس منظر میں ہے، اخیر میں حاضرین کے اصرار پر پھر اس حقیر نے کچھ گزارشات پیش کیں، جن میں اہم بات یہ تھی کہ یہ ملک مسلسل مغربی طاقتوں کی یلغار کا ہدف رہا ہے، اور مغربی استعمار کا یہ مزاج ہے کہ وہ جہاں کہیں پہنچتے ہیں، اپنی فکر کو بھی نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور نوجوان نسل بالخصوص جدید تعلیم یافتہ گروہ اس سے متأثر ہوجاتا ہے؛ اس لئے اس کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے، میرے خطاب سے پہلے کابل کے ایک بزرگ عالم دین اور محدث مولانا عبدالحمید حماسی کا بھی خطاب ہوا اور انھوں نے افغانستان اور کابل کے بارے میں ڈھیر ساری قیمتی معلومات فراہم کیں، ماشاءاللہ ان کا پورا خاندان علمی خانوادہ ہے، اور سبھوں کو حدیث سے عشق رہا ہے، وہ مجھ سے افغانستان کے حالات بیان کرتے ہوئے سسکیاں لے کر رونے لگے، انھوں نے بتایا کہ کتنے ہی شاگرد ہیں جن کو ہم شعبان میں رخصت کرتے ہیں، اور جب شوال میں ان کے بارے میں معلوم کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شہید کردیئے گئے، پھر مغلوب الجذبات ہوکر کہنے لگے کہ ان شاء اللہ شہیدوں کا یہ خون رائیگاں نہیں جائے گا، اور افغانستان ایک معیاری اور مثالی اسلامی مملکت بن کر رہے گا، بہر حال اخیر میں مولانا ابراہیم صاحب مہتمم دارالعلوم نعمانیہ نے ہدیۂ تشکر پیش کیا اور اس حقیر کی دعاء پر سیمینار کا اختتام عمل میں آیا، اس سیمینار میں افغانستان کے تمام علاقوں سے ۱۱۵/ نمایاں علمی شخصیتیں اور خاص کر اربابِ افتاء شریک ہوئے اور تیس مقالات پیش ہوئے، جو نوسو صفحات پر مشتمل ہیں۔

نماز ظہر کے بعد میزبانوں نے ہم لوگوں کے لئے ایک تفریحی پروگرام طے کیا تھا؛ چنانچہ پہلے ہم کابل سے کچھ فاصلے پر قرغہ نامی جھیل لے جائے گئے، یہ بڑی خوبصورت اور صاف وشفاف جھیل ہے، جہاں برف کا پگھلا ہوا پانی جمع ہوتا ہے، اس کے چاروں طرف ہرے بھرے درخت اور خوب صورت پھولوں کے پودے ہیں، لوگ اس وسیع وعریض جھیل میں کشتیوں اور بوٹوں کے ذریعہ سیر کرتے ہیں، ہم لوگ تھوڑی دیر یہاں رُک کر اور اس قدرتی نظارہ کا لطف اُٹھا کر آگے بڑھے، یہاں سے دوتین کیلومیٹر کے فاصلے پر پغمان نامی مقام ہے، اس کے چوراہے پر ''باب آزادی'' بنا ہوا ہے، جو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی یادگار ہے، کہا جاتا ہے کہ امان اللہ خان انگریزوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد اسی راستے سے کابل میں داخل ہوئے تھے، جیسے دہلی کے انڈیا گیٹ پر مجاہدین آزادی کے نام کندہ کئے گئے ہیں، اسی طرح برطانوی استعمار سے آزادی حاصل کرنے کی جنگ میں جو لوگ شہید ہوئے، یہاں

ان کے نام کندہ کئے گئے ہیں، سابق صدر افغانستان احمد کرزئی صاحب نے یہاں اپنے دور میں ایک خوبصورت اور وسیع پارک بنایا ہے، اس پارک میں ایک محل بھی تعمیر کیا گیا ہے، جو کافی بلندی پر ہے، اور مختلف ہالوں اور سنگ مرمر کے وسیع صحن پر مشتمل ہے، نیچے دور تک سبزہ زار اور خوبصورت پھولوں اور ہرے بھرے درختوں کا منظر نہایت ہی دل کش ہے، اور چوں کہ یہ پہاڑی پر واقع ہے؛ اس لئے سبک خرام ہواؤں کا قافلہ بھی اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے گزرتا اور آنے والوں کے لئے راحت کا سامان مہیا کرتا ہے، افغانستان اور بعض دیگر وسط ایشیائی ممالک میں اہل فارس کا قدیم تیوہار نوروز منایا جاتا ہے، اور ہر سال باری باری کسی ایک ملک میں نوروز کی مرکزی تقریب رکھی جاتی ہے، چند سال پہلے یہ تقریب افغانستان کے حصہ میں آئی تھی، اس تقریب کے لئے بہت ہی کم وقت میں اس پارک کی تعمیر ہوئی؛ لیکن تقریب کے منعقد ہونے سے پہلے ہی طالبان نے اعلان کر دیا کہ نوروز کی تقریب غیر اسلامی فعل ہے؛ اس لئے وہ اس کی اجازت نہیں دیں گے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تقریب یہاں کے بجائے صدارتی محل میں منعقد ہوئی؛ لیکن اس بہانے یہ خوبصورت تفریح گاہ بن گئی، عصر کی نماز ہم لوگوں نے اسی پارک میں ادا کی۔

ہمارا قافلہ جو ۲۵ / ۲۶ / افراد پر مشتمل تھا، یہاں سے کابل کے مرکز دعوت وتبلیغ کی طرف روانہ ہوا، یہ مرکز شہر کے اہم علاقہ میں شارع عام سے متصل اور قصر صدارت کے قریب واقع ہے، مرکز کی چار منزلہ مسجد بہت ہی وسیع وعریض ہے اور اس میں ہزاروں افراد کے قیام کی گنجائش ہے، یہاں بہت سارے افراد سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک تعداد اُردو سمجھنے والوں کی بھی تھی، جماعت کے حلقہ میں اس وقت جو اختلاف چل رہا ہے، اس کا اثر افغانستان میں بھی ہے؛ لیکن کابل کا یہ مرکز پاکستان کے مرکز رائے ونڈ کے تحت کام کر رہا ہے۔

آج احباب نے عشائیہ کا انتظام مرکز کے قریب ''صلح ریسٹورینٹ'' میں رکھا تھا، یہ ریسٹورنٹ گویا ایک پارک کی شکل میں تھا، جس میں ہرے بھرے پودے اور سبزہ زار بھی تھے اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے چھپر کے کیبن بھی بنے ہوئے تھے، میز اور کرسیوں کا بھی نظم تھا، اور افغانی ثقافت کے مطابق فرش، گاؤتکیہ اور دسترخوان کا بھی، افغانستان میں پکوان عمدہ اور لذیذ ہوتے ہیں؛ لیکن کم سے کم تیل اور مسالہ کا استعمال ہوتا ہے؛ اس لئے طبیعت پر کوئی بوجھ بھی نہیں ہوتا، افغانی پلاؤ میں مغزیات اور کشمش کا بہت استعمال کیا جاتا ہے، جو اس کی لذت کو دوچند کرتا ہے، روٹیاں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں، اور کباب بھی انواع واقسام کے بنتے ہیں، یہاں مختلف قسم کے کباب اور نان سے دسترخوان سجایا گیا، مجھ جیسے لوگوں کو افغانستان جیسے جنگ زدہ ملک میں ایسے کھانے کا تصور نہیں تھا؛ لیکن جب کسی چیز کا اعلیٰ ذوق ہوتا ہے تو وہ ہر حال میں قائم رہتا ہے، یہ بات یہاں دیکھنے کو ملی۔

۲۸ / جون کو جمعہ کا دن تھا، کابل کے احباب میں ایک مخلص دوست مولانا گل محمد نورستانی ہیں، انہوں نے اپنے ادارہ مدرسہ فاروقیہ فتحیہ کی بنیاد رکھنے کے لئے دعوت دی، یہ شہر کے کنارے کی جگہ ہے، اور پہاڑ کے دامن میں

واقع ہے، جگہ تو ہموار اور وسیع ہے؛ لیکن فی الحال کوئی عمارت نہیں ہے؛ بلکہ ایک خیمہ ڈال دیا گیا ہے، اسی میں محلہ کے بچے آتے ہیں، اور ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں، یہ منظر دیکھ کر مدرسہ صفہ کی یاد آ گئی، جس میں صحابہ کی رہائش محض ایک چبوترے پر تھی، اور دارالعلوم دیوبند کا بھی خیال آیا، جسے انار کے درخت کے نیچے قائم کیا گیا تھا، محلے کے اہم افراد اور مقامی لیڈران بھی آ گئے، جن میں زمین وقف کرنے والے حضرات بھی شامل تھے، موقع کی مناسبت سے مدرسہ کی اہمیت پر مختصر گفتگو کرتے ہوئے دُعاء کی گئی، کابل کا موسم کچھ ایسا ہے کہ حالاں کہ دھوپ تھی؛ لیکن خیمہ کے اندر گرمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

کابل کی ایک نو تعمیر شدہ بڑی اور خوبصورت مسجد ''جامع حاجی عبدالرحمٰن'' ہے، جس کے چاروں طرف ہرے بھرے چمن بنے ہوئے ہیں، یہیں جمعہ کی نماز ادا کی گئی، جمعہ کے خطیب مولانا محمد یونس سادات کے ہم درس تھے، جو اس وقت کابل کے محکمۂ اوقاف کے ذمہ دار ہیں، اسی جگہ ''کندوز ریسٹورینٹ'' میں ظہرانہ تناول کیا گیا، اس کے مالکان تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، اور علماء کے بے حد قدرداں ہیں؛ حالاں کہ ہمارے ساتھ ۱۴/۱۵/افراد تھے اور پہلے سے ان کو اطلاع نہیں کی گئی تھی؛ لیکن انھوں نے بہت عمدہ ضیافت کی اور پیسہ لینے سے بھی انکار کر دیا، فجزاہ اللہ خیرالجزاء۔

کابل کی تاریخی عمارتوں میں ایک قصر ''دارالامان'' ہے، یہ افغانیوں کے بابائے قوم امیر امان اللہ خان کا محل ہے، جنگ میں یہ عمارت تباہ و برباد ہوگئی تھی، اب پھر اس کی مرمت کرائی جا رہی ہے، اس کے پیچھے افغانستان کی نو تعمیر شدہ پارلیامنٹ ہے، جس کو حکومت ہند نے تعمیر کرایا ہے، اس کا ڈیزائن افغان طرز تعمیر کے مطابق ہے، عمارت کے اوپر ایک خوبصورت سرخی مائل سنہرے رنگ کا چمکتا ہوا بڑا سا گنبد ہے، اسی راستہ میں گلبدین حکمت یار کا مکان ہے، جو جنگ افغانستان کے مشہور مجاہدین میں سے ہیں، اور اس وقت حکومت میں شامل ہیں، یہ جگہ انھیں حکومت کی طرف سے دی گئی ہے، ان کے علاوہ جنگ روس کے دوسرے اہم مجاہدین کو بھی بڑی بڑی جگہیں دی گئی ہیں؛ چنانچہ پغمان کے قریب ایک اور فوجی کمانڈر جناب عبدرسول رب سیاف کا مکان بھی ایک وسیع قطعۂ زمین میں واقع ہے، وہاں سے بھی ہم لوگوں کا گذر ہوا، یہ اچھی بات ہے کہ حکومت نے سابق مجاہدین کی قدردانی کی ہے۔

یہاں سے قریب ایک مقبرہ ہے، مشہور ہے کہ، لیث بن قیس بن عباس، یعنی عم رسول حضرت عباس کے پوتے کا مقبرہ ہے؛ لیکن تاریخ ورجال کی کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی؛ کیوں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحب زادے کے تذکرے میں لیث نام کے کسی صاحب زادے کا ذکر نہیں ہے، شاید حجاز سے آنے والے قافلے میں لیث نامی شخص رہے ہوں اور ان کے والد کا نام بھی عباس ہو، اس سے لوگوں کو اشتباہ ہو گیا ہو، واللہ اعلم۔

یہاں ایک مسجد ہے جو ''مسجد شاہ دو شمشیر'' سے معروف ہے، مسجد پر لگے ہوئے کتبہ کے مطابق حضرت

عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی بنیاد رکھی تھی، یہ فتح مکہ کے موقع سے مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے سجستان اور کابل کا علاقہ فتح کیا تھا، اور عبداللہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو سجستان کا والی بنایا تھا، ان کی وفات ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں بصرہ میں ہوئی، اس مسجد کو ''مسجد شاہِ دوشمشیر'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو فوج کابل کو فتح کرنے کے لئے آئی تھی، اس میں ایک مجاہد بیک وقت دونوں ہاتھوں سے تلوار چلاتے تھے، کچھ ہی فاصلے پر دریائے کابل ہے، جس کی دونوں طرف پتھر کی دیواریں بنی ہوئی ہیں، اس کا عرض وسیع ہے، ابھی تو پانی کی مقدار کم تھی؛ لیکن بارش اور برف کے موسم میں پورا دریا لبریز ہو جاتا ہے، اس کے ساحل پر ایک وسیع اور قدیم مسجد ہے، جو ''پُل خشتی مسجد'' کہلاتی ہے، لوگ بتاتے ہیں کہ اس مسجد میں چھ ماہ خواجہ حسن بصریؒ کا قیام ہوا تھا، اور یہیں ان کے درس کی محفلیں لگتی تھیں، یہیں سے کچھ آگے ''مسجد تخت سلیمان'' ہے، اس جگہ کو لوگ ''خواب گاہِ سلیمان'' کہتے ہیں، لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس جگہ قیلولہ کیا کرتے تھے، مسجد پُل خشتی کے باہر بہت ہی مشغول بازار ہے، جس میں برصغیر کے قدیم بازاروں کی طرح چھوٹی چھوٹی فٹ پاتھ کی دُکانیں ہیں اور شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے، یہ مسجد جنگ کے دوران کافی متاثر ہوگئی تھی، اس کا فرش اور صحن افغانستان کے سفید اور ٹھنڈے سنگ مرمر سے تیار کیا گیا ہے۔

مسجد پُل خشتی سے ہم لوگ ائیر پورٹ کی طرف اور وہاں سے ہرات کے لئے روانہ ہوئے، اس سفر میں مولانا امتیاز احمد قاسمی صاحب کے علاوہ دارالعلوم ہرات کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ وثیق احمد صاحب بھی شامل تھے، یہ ایک پختہ کار مقبول مدرس اور باصلاحیت مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ متواضع اور ملنسار شخصیت کے حامل ہیں، جو فارسی اور پشتو کے علاوہ اُردو بھی اچھی خاصی جانتے ہیں، ایک گھنٹے کی مسافت طے کر کے ہم لوگ ہرات پہنچے، یہاں دارالعلوم ہرات کے ناظم مفتی سروَر صاحب، مولانا عبدالخالق صاحب (جو طالبان کے دور حکومت میں وزیر اوقاف تھے) نیز دارالعلوم کے اساتذہ کے بہ شمول تقریباً پندرہ بیس افراد ائیر پورٹ پر موجود تھے، ہم لوگ ائیر پورٹ سے سیدھے دارالعلوم پہنچے، یہاں اساتذہ، طلبہ اور منتظمین نے بڑی محبت کے ساتھ استقبال کیا، مولانا عبدالشکور (فاضل دارالعلوم زاہدان) کو ہم لوگوں کی ضیافت پر مامور کیا گیا تھا، انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ ایک ایک ضرورت کا خیال رکھا، مولانا عبدالخالق صاحب کافی معمر ہیں؛ لیکن واقعی مردِ مجاہد ہیں، وہ عوام وخواص کے درمیان بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، ان کا وطن ہرات سے قریب فراہ نامی جگہ میں ہے۔

اگلے دن ۲۹ رجون کو دارالعلوم میں دو پروگرام تھے، ایک تو بخاری کا افتتاح کرنا تھا، یہ سعادت اس حقیر کے ذمہ تھی، اساتذہ وطلبہ کے اصرار پر اجازت حدیث بھی دی گئی، شیخ الحدیث مولانا عبداللہ وثیق صاحب نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا، یہاں دورۂ حدیث کے ایک طالب علم حافظ قمرالدین سے ملاقات ہوئی، جو قرآن مجید کے

ساتھ ساتھ بخاری شریف کے بھی حافظ ہیں، دارالعلوم میں آج دوسرا پروگرام بعد نماز ظہر دارالعلوم کے وسیع ہال میں تھا، اس میں ہرات کے مختلف مدارس کے اونچے اساتذہ، شہر کے اہم علماء اور یونیورسٹیوں کے بعض اساتذہ مدعو تھے، میزبان کی طرف سے استقبالیہ اور اس حقیر کے لئے کلمات سپاس پیش کئے گئے، پھر ہرات یونیورسٹی کے تحت شیخ عبدالرؤف مخلص ازہری نے افغانستان اور ہرات کی تاریخ اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل پر عربی زبان میں اپنا مقالہ پیش کیا، ان کا مقالہ خاصا طویل تھا، اس کے بعد اس حقیر کا خطاب ہوا، راقم نے اپنے خطاب میں اعتدال، اسلام کا دفاع اور مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف ہونے والی فکری یلغار پر خصوصی توجہ دلائی اور عرض کیا کہ آج کا اصل جہاد یہی ہے کہ دین کی فکری سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔

آج کا دن اس سفر کا بہت ہی اہم دن تھا، جس میں کئی یادگاروں کو جانے اور تاریخی مقامات کو دیکھنے کا موقع ملا، سب سے پہلے ہم لوگ امام فخر الدین رازیؒ ''صاحب مفاتیح الغیب'' کی قبر پر گئے، قبر کی زیارت کی اور فاتحہ پڑھا، یہاں ایک مدرسہ بھی ہے، وہاں سے قریب ملاحسین واعظ کاشفی کی قبر پر حاضری کا موقع ملا، ''تفسیر حسینی'' کے نام سے فارسی زبان میں ان کی تفسیر ہے، جس میں اسرائیلی اور موضوع روایتیں بھی اچھی خاصی ہیں، ان کو اہل سنت بھی اپنا بزرگ مانتے ہیں اور شیعہ بھی، شیعہ حضرات اہل بیت کے بارے میں ان کے اشعار محرم کے موقع پر پڑھتے ہیں، اس کے بعد مشہور شاعر اور نعت گو مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے مرقد پر حاضری ہوئی، مولانا جامیؒ کی قبر کے ایک طرف ان کے استاذ علامہ کاشغریؒ اور دوسری طرف ان کے تلمیذ رشید علامہ عبدالغفور لاری کی قبریں ہیں، یہاں سے پھر ہم لوگ آگے بڑھے، ایک اور بزرگ کی قبر پر لے جایا گیا، ان کا نام خواجہ یحییٰ عمار سجستانیؒ ہے اور یہ خواجہ غلطان کے نام سے مشہور ہیں، ان کی مزار کے پاس ایک پتھر رکھا ہوا ہے، کہا جاتا ہے کہ جو اس پر سر رکھتا ہے، وہ کروٹ بدلتے ہوئے چھ سات قدم تک جاتا ہے، ہم لوگوں کے سامنے بھی بعض لوگوں نے پتھر پر سر رکھا اور وہ اسی طرح الٹتے پلٹتے ہوئے کچھ فاصلے پر جا کر رُکے، معلوم نہیں یہ کرتب ہے یا اس میں کچھ حقیقت ہے، یا کسی اَن دیکھی مخلوق کا فعل اس میں شامل ہے؟

یہاں سے آگے ہم لوگ شیخ ابوالولید آزادانی کے مزار پر پہنچے، یہ امام بخاریؒ کے استاذ اور امام احمد بن حنبلؒ کے تلمیذ ہیں، بخاری نے اپنی کتاب میں ان سے ۱۳/ یا ۱۴/ روایتیں لی ہیں، یہاں کچھ دیر تک توقف کیا اور فاتحہ پڑھا، اس کے پیچھے ان عرب شہداء کا مقبرہ ہے، جو روسیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے، یہاں ایک بزرگ استاذ العلماء حضرت مولانا نور احمد فائز مدظلہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ اس دیار کے بڑے عالم استاذ الاساتذۃ مولانا نصیر الدین غوغشتیؒ کے واحد شاگرد ہیں، جو باحیات ہیں، ان کی عمر ۹۰/ سال سے زیادہ ہے،

اور ۶۰؍سال سے تدریس کی خدمت میں مصروف ہیں، فارسی زبان ہی میں بات کرتے ہیں، عربی بھی بہت کم بولتے ہیں، دیکھنے میں بھی بہت معصوم اور نورانی صورت کے ہیں، میری خواہش پر میرے لئے دُعاء بھی کی اور پھر مجھ سے بھی اصرار کر کے اپنے لئے دُعاء کرائی، یہاں سے نکل کر جس سڑک سے ہم لوگ آگے بڑھے، اس کے چوراہے پر''باب قندھار'' کا علاقہ ہے، اس جگہ مجاہدین اور شہداء کی ایک مصوّر یادگار بنائی گئی ہے، بتایا گیا کہ روس نے ایک ہی دن میں بم باری کر کے ۲۴؍ ہزار افراد کو شہید کر دیا تھا، یہ اسی کی یادگار ہے، آگے بڑھتے ہوئے ایک سڑک ملی، جس کا نام''شارع ملاعلی قاریؒ'' ہے، شارح مشکوٰۃ ملاعلی قاریؒ کا تعلق ہرات ہی سے تھا، یہ سڑک ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔

پھر دارالعلوم ہرات آ کر اور کچھ دیر آرام کر کے ہم لوگ شیخ عبداللہ انصاریؒ کے مزار پر گئے، اس مزار کو سب سے بڑھ کر لوگوں کا مرجع پایا، ان کو''پیر ہرات'' کہا جاتا ہے، ان کے مزار کے قریب ہی مشہور افغان حکمراں امیر دوست محمد خان مرحوم کی قبر بھی ہے، یہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم لوگ ایک قومی یادگار پر لے جائے گئے، جو درختوں سے ڈھکی ہوئی بلند پہاڑیوں پر بنائی گئی ہے، یہ بڑی خوبصورت جگہ ہے، جو ایک تفریحی مرکز بن گئی ہے، جس سے پورا شہر ہرات نظر آتا ہے، اس جگہ روس کی شکست کے بعد ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے، جس کو''خانۂ جہاد'' کا نام دیا گیا ہے، ہم لوگوں نے یہیں عصر کی نماز بھی ادا کی، اس پہاڑی سے اُترنے کے بعد کچھ ہی فاصلے پر ہندوستانی سفارت خانہ ہے، جس پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہے، اپنے ملک سے باہر اپنا جھنڈا دیکھ کر بڑی خوشی محسوس ہوئی، ہندوستان نے وہاں بہت سارا ترقیاتی اور فلاحی کام کرایا ہے، پارلیامنٹ کے علاوہ سڑکوں اور ہاسپیٹلوں کی تعمیر وغیرہ، اسی طرح معلوم ہوا کہ چارسو بسیں افغانستان کو ہندوستان کی طرف سے تحفہ میں دی گئی ہیں، ہندوستانی آٹو بھی وہاں مقبول ہے؛ حالاں کہ پاکستان اور خود افغانستان کی بنائی ہوئی تین پہیوں کی گاڑیاں بھی موجود ہیں؛ لیکن ہندوستانی آٹو زیادہ مقبول ہے، اور ہندوستان کے سلوک کی وجہ سے عمومی طور پر لوگ ہندوستان کے احسان مند ہیں، طالبان کو عام طور پر میڈیا میں ہندوستان مخالف باور کرایا جاتا ہے؛ لیکن وہاں لوگوں نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہماری لڑائی صرف امریکہ سے ہے، نہ کسی اور ملک سے ہے اور نہ کسی مذہب سے۔

ہندوستانی سفارت خانہ سے گزرتے ہوئے کچھ آگے بڑھے تو ایک میوزیم نظر آیا، ہماری خواہش پر مفتی سروَر صاحب اور ان کے رفقاء ہمیں یہاں بھی لے گئے، جانے کے بعد احساس ہوا کہ اگر اس میوزیم میں نہ آئے ہوتے تو ایک اہم چیز چھوٹ جاتی، یہ جہاد افغانستان کا میوزیم ہے، مجاہدین نے روسیوں کے چھوٹے بڑے بہت سے ہتھیار چھین لئے تھے، یہاں ان کو یادگار کے طور پر رکھا گیا ہے، جس میں پستول سے لے کر فوجی ہیلی کاپٹر تک سب کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا ہے، میوزیم کی اندرونی عمارت میں مجسموں کے ذریعہ میدان جنگ کی بہترین نقاشی

کی گئی ہے، روسی فوجیوں کو آتے ہوئے اور واپس جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے، دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ میدان جنگ میں ہے، اسماعیل خان کی دعوت پر روس کے خلاف جہاد کے لئے قبائلی سرداروں کی میٹنگ ''غور'' کے قصبہ ساغر میں منعقد ہوئی تھی، اس کو بھی مجسموں کے ذریعہ دکھایا گیا ہے، بیرونی پارک میں بنائی گئی دیواروں پر ۲۸ /سو شہداء کے نام کندہ ہیں، یہ مشہور اور اہم شہداء ہیں، جنھوں نے مادرِ وطن اور دین کے لئے قربانیاں دی تھیں، بہر حال یہ بڑا ایمان افروز میوزیم ہے، جس کو دیکھ کر اللہ کی نصرت پر یقین بڑھتا ہے۔

چوں کہ ہم لوگوں کو بہت اشتیاق جامع ہرات کو دیکھنے کا تھا اور مغرب کا وقت قریب تھا؛ اس لئے ہم لوگ وہاں سے تیز تیز مسجد کی طرف روانہ ہوئے، اس مسجد کو ''جامع شریف'' کہا جاتا ہے، محمد حکم ناہض نے ''قاموس جغرافیہ افغانستان'' میں اور بعض دوسرے واقعہ نویسیوں نے لکھا ہے کہ پورے خراسان اور ماوراء النہر میں اس سے خوبصورت کوئی مسجد نہیں ہے، واقعی اس دعویٰ میں صداقت معلوم ہوتی ہے، اس مسجد کا صحن چار ہزار نو سو بیس مربع میٹر پر مشتمل ہے، قبلہ کی سمت دائیں اور بائیں نیز صحن کے دونوں طرف مسقّف مسجد کے مختلف ہال ہیں، جاڑے کے موسم میں اسی حصے میں نماز ادا کی جاتی ہے، دائیں بائیں اور سامنے تینوں طرف سے مسجد میں داخل ہونے کے دروازے ہیں، صحن میں وضوء کے لئے خوبصورت حوض ہے اور قبلہ کی مخالف سمت والے برآمدے میں ایک دیگ رکھی ہوئی ہے، جس کی چوڑائی ڈیڑھ میٹر اور گہرائی دو میٹر ہے، اس دیگ میں متبرک دنوں اور راتوں میں شربت بنایا جاتا اور حاضرین کو پلایا جاتا ہے، یہ پہلے آتش پرستوں کی عبادت گاہ تھی، جب یہاں کے باشندے مسلمان ہو گئے تو انھوں نے اس جگہ کو مسجد میں تبدیل کر کے اس کی تعمیر نو کی، اس کی دیواروں پر بہت خوبصورتی کے ساتھ نقشے بنائے گئے ہیں، میں نے ایران کے علاوہ کہیں ایسی آراستہ اور مزیّن دیواریں نہیں دیکھیں؛ چوں کہ ہرات کا علاقہ بھی ایران سے متصل ہے؛ اس لئے طرز تعمیر کی یکسانیت باعث تعجب نہیں، مسجد کے اندر دو عالیشان مینار ہیں اور معلوم ہوا کہ چاروں طرف بحیثیت مجموعی بارہ مینار ہیں۔

نماز کے بعد ہم لوگ یہاں سے قریب ہی جامع علامہ سعد الدین تفتازانیؒ آئے، علامہ سعد الدین تفتازانیؒ کی اہمیت برصغیر کے کسی عالم کے لئے محتاج بیان نہیں، اس مسجد میں علامہ تفتازانیؒ نے دو بار دو دو سال قیام کیا ہے، اور بلاغت و معانی پر اپنی مشہور کتاب مطول کے مسودے کی اسی مسجد میں تبییض کی ہے، اس وقت اس مسجد میں ''دار العلوم عالی ہرات'' قائم ہے، جس میں دورۂ حدیث اور اس کے بعد تخصصات تک تعلیم ہوتی ہے، دورۂ حدیث میں ۱۲۰ /طلبہ ہیں، یہاں کے ذمہ دار اعلیٰ حضرت مولانا جلیل اللہ صاحب دامت برکاتہم ہیں، جو بخاری کا درس دیتے ہیں، ان کی عمر ۹۰ /سال سے متجاوز ہے، وہ کثیر التصنیف عالم ہیں، اور متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے، فارسی

زبان میں ۳۰؍جلدوں پر مشتمل تفسیر لکھی ہے، جن میں بعض جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور بعض زیر طبع ہیں، اس حقیر کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے، قاموس الفقہ اور جدید فقہی مسائل کی دل کھول کر تعریف کی اور فرمایا کہ مجھے آپ سے غائبانہ محبت ہے، بے حد شفقت کا معاملہ فرمایا، یہاں بہت سے علماء جمع ہو گئے، جن میں اس دار العلوم کے اساتذہ بھی تھے اور شہر کی سر برآوردہ شخصیتیں بھی، ان میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا صبغۃ اللہ صاحب کا ہے، جو مولانا جلیل اللہ صاحب کے صاحبزادے ہیں، یہ بھی صاحب تصنیف علماء میں ہیں، اور فقہ وفتاویٰ کا مرجع تصور کئے جاتے ہیں؛ چوں کہ یہ ایک بار اکیڈمی کے سیمینار میں تشریف لا چکے ہیں؛ اس لئے یہ پہلے سے مانوس تھے، یہیں نماز مغرب ادا کی گئی، امام صاحب نے بڑی نفیس قرأت کی اور افغانستان میں ہر جگہ ہی ائمہ مساجد بہت عمدہ قرأت کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہرات عہد تابعین ہی سے علماء کا مرکز رہا ہے، اس کے قرب وجوار میں بھی بہت سے فقہاء ومحدثین اور صوفیاء ومجاہدین آسودۂ خاک ہیں، مشہور حنفی فقیہ ابوجعفر ھندوانی کا وطن ''ہند وان'' یہاں سے صرف چار کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، یہیں سے قریب ایک قصبہ گلِ رانا ہے جو شہر بند تعلقہ میں پڑتا ہے، مصابیح کے مصنف محی الدین بن فرّا البغویؒ (۴۳۶-۵۱۶ھ) یہیں کے رہنے والے تھے، بعض اہل علم نے اس قصبہ کا نام ''بغشور'' لکھا ہے، یہاں سے ۶۰؍کیلومیٹر کے فاصلے پر سلسلۂ چشتیہ کے مؤسس شیخ مودود چشتیؒ (۴۳۰-۵۲۷ھ) کا وطن چشت ہے، ۳۵؍کیلومیٹر کے فاصلے پر کرّوخ واقع ہے، ابوالحسن کروخ (۴۶۲-۵۴۸ھ) یہیں کے رہنے والے تھے، جو سنن ترمذی کے مشہور ناقلین ہیں، ہندوستان میں ترمذی کا جو نسخہ متداول ہے، وہ ان ہی کے واسطہ سے ہے، فاتح عراق عبداللہ بن عامرؓ (۴-۵۹ھ) کی قبر یہاں سے دوسو کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے، غرض کہ فارسی شاعر کے بقول :

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

سر سے لے کر پاؤں تک جہاں بھی دیکھتا ہوں، محبوب کا کرشماتی حُسن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہ یہی جگہ اصل جگہ ہے۔

اگلی صبح ۳۰؍جون ۲۰۱۹ء کو ہم لوگ بذریعہ فلائٹ کابل واپس ہو گئے، آج دو اداروں کو دیکھنے کا موقع ملا، ایک دار العلوم افغان، اس کے بانی اور سرپرست اعلیٰ روس افغانستان جنگ کے مشہور مجاہد ملا عبدالسلام ضعیف ہیں، ملا ضعیف پاکستان میں طالبان کے سفیر تھے؛ لیکن امریکہ کے مطالبہ پر نہایت بے شرمی کے ساتھ حکومت پاکستان اور اس کے سربراہ پرویز مشرف نے ان کو امریکہ کے حوالہ کر دیا، ظاہر ہے یہ عمل نہ اسلامی واخلاقی نقطۂ نظر سے درست تھا، نہ بین الاقوامی قانون کے لحاظ سے، پھر امریکی فوج نے ان پر نہایت انسانیت سوز مظالم ڈھائے، انھوں نے اپنی جیل کی آپ بیتی تحریر کی ہے، جس کو پڑھ کر آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور امریکہ کے جبر واستبداد کی تصویر سامنے آتی ہے۔

بہر حال اب ملاضعیف کی محنتوں کا رُخ تعلیم کی طرف ہے، انھوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ مدارس اور یونیورسیٹیاں قائم کی ہیں، اور بعض فلاحی ادارے بھی چلا رہے ہیں، ان کے ادارہ کا نام دارالعلوم افغان ہے، دارالعلوم افغان ظاہری ومعنوی دونوں پہلوؤں سے تیزی کے ساتھ ترقی کی طرف گامزن ہے، یہاں کا تعلیمی نظام بہت اچھا سمجھا جاتا ہے، مولانا محب اللہ یہاں کے شیخ الحدیث ہیں، مدرسہ کے مہتمم مولانا نور اللہ عزام ہیں اور برادر خورد مولانا عبدالحق حماد بھی فعال مدرس ہیں، اور خوش اخلاق نوجوان ہیں، ظہرانہ کے بعد مسجد کے اندر اُردو زبان میں میرا خطاب ہوا اور وہاں کے استاذ مفتی عبدالرؤف قاسمی صاحب نے بڑی عمدگی سے اور دلچسپ انداز میں پشتو میں ترجمہ کیا، میں نے اپنے خطاب میں عرض کیا کہ ایک تو وہ جہاد ہے، جو آپ نے انگریزوں اور روسیوں سے استعمار کے خلاف کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس میں افغان قوم کو کامیابی عطا فرمائی؛ لیکن اس سے اہم جہاد وہ ہے، جس کی ضرورت فکری میدان میں ہے، جس کو ''الغزو الفکری'' کہتے ہیں، یعنی مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف جو شکوک وشبہات اُٹھائے جاتے ہیں، علماء ان کا جواب دینے اور غلط فہمیوں کو دُور کرنے کا کام کریں، یہ جہاد اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے جہاد بالسیف سے بھی زیادہ اہم ہے۔

کابل میں ایک اہم جامعہ دارالعلوم عالی امام اعظم ابوحنیفہؒ بھی ہے، یہ حکومت کے زیر انتظام ہے، اس میں تین ہزار طلبہ پڑھتے ہیں، جن میں سے ایک ہزار دارالاقامہ میں رہتے ہیں، اس دارالعلوم کا کیمپس کافی بڑا ہے، عمارت بھی خوبصورت اور وسیع ہے، بڑا احاطہ ہے، اور اس میں چمن بندی کا بہت اچھا انتظام ہے، اتنا وقت نہیں تھا کہ وہاں جایا جائے؛ لیکن میری خواہش ہوئی کہ گاڑی پر بیٹھے بیٹھے کم سے کم احاطہ کا ایک چکّر ہی لگا لیا جائے؛ کیوں کہ اس کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کو مرتب کرنے کے لئے امیر افغانستان امان اللہ خان نے علامہ سید سلیمان ندویؒ اور دیگر علماء کو دعوت دی تھی، بہر حال جب ہم لوگ پہنچے تو نماز عصر ہو چکی تھی اور دفاتر بند ہو چکے تھے، صرف ''مدیر تنفیذ'' جس کو فارسی میں ''مدیر اجرائی'' کہتے ہیں، سے سرسری ملاقات ہوئی، وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ تھوڑی دیر رُکیں لیکن اس کا موقع نہیں تھا؛ اس لئے ہم لوگ واپس ہو گئے؛ تاہم یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ افغانستان میں حکومت کی طرف سے بھی بڑے بڑے مدارس کا انتظام ہے؛ اگر چہ وہاں سرکاری دارالعلوم میں بھی باضابطہ تعلیم وتعلم کا نظم ہے، اتنا بُرا حال نہیں ہے جو ہندوستان کے بورڈ کے مدارس میں دیکھا جاتا ہے؛ لیکن جیسے ہمارے ملک میں حکومت کے اثر سے آزاد دینی مدارس جس بہتری کے ساتھ تعلیمی خدمت کرتے ہیں، سرکاری بورڈ کے مدارس میں اس کا فقدان ہے، کسی قدر فرق کے ساتھ یہی کیفیت وہاں بھی ہے، اور یہ چنداں باعث تعجب نہیں؛ کیوں کہ آزاد مدارس میں ہزار کمیوں کے باوجود کچھ نہ کچھ اللہ کی رضا جوئی کا جذبہ ضرور باقی رہتا ہے، مگر حکومت کے زیر اثر چلنے والے اداروں میں یہ جذبہ عملاً مفقود ہوتا جا رہا ہے، اور ایک دنیوی کاروبار کی طرح اس کو انجام دیا جاتا ہے۔

افغانستان رقبہ کے اعتبار سے ایک بڑا ملک ہے، ملک کی وسعت کی وجہ سے بھی اور امن وامان کی صورت کے لحاظ سے بھی میرا یہ سفر کابل اور ہرات تک محدود رہا، دوسرے علاقوں میں جانے کی نوبت نہیں آئی؛ لیکن فقہی سیمینار کی نسبت سے ملک کے اکثر علاقوں قندھار، بلخ، نیمروز، بدخشتان، مزارشریف وغیرہ کے منتخب علماء سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک اہم نام محب گرامی حضرت مولانا عبدالہادی حماد (قندھار) کا ہے، جو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار میں تشریف لا چکے ہیں، وہ قندھار کے ایک دارالعلوم کے ذمہ دار ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اس ملک میں قندھار علماء کا سب بڑا مرکز ہے، اور گویا مذہبی راجدھانی ہے، اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ بڑی محبت سے پیش آئے اور ان کی ملاقات نے سفر کے لطف کو دوبالا کر دیا۔

افغانستان کے سفر میں بحیثیت مجموعی دل میں جو احساسات اُبھرے، ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، ان میں پہلی بات استقامت اور ثابت قدمی ہے، اپنی ثابت قدمی اور قوتِ ایمانی کے ذریعہ انھوں نے انگریزوں اور روسیوں کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اور امریکہ بھی اپنی شکست کے آخری مرحلہ پر ہے؛ حالاں کہ ان کے پاس ان جدید ہتھیاروں کا عشر عشیر بھی نہیں تھا، جو اُن پر حملہ کرنے والی ظالم طاقتوں کے پاس تھا؛ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے جذبۂ ایمانی اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نصرت ومدد نے اس دور میں عہد صحابہ کی یاد تازہ کر دی، اس سفر میں بہت سے علماء، عوام اور خواص سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک تعداد ان لوگوں کی تھی، جن کے اعزہ اس مہم میں شہید کر دیئے گئے؛ لیکن نہ کسی کی زبان پر آہ وبکا کے کلمات سننے میں آئے اور نہ ان کو اپنی تقدیر پر شکوہ سنج پایا؛ بلکہ ہر ایک کی زبان پر شکر کے الفاظ اور اللہ پر یقین کے کلمات ہی سنے گئے، یہ وہ اُسوہ ہے جو پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے قابل توجہ ہے۔

دوسری چیز جو مجھے غیر معمولی محسوس ہوئی وہ ان کا جذبۂ قناعت ہے، جو ملک کئی دہوں سے جنگ کو جھیل رہا ہو، وہاں کے لوگ معاشی اعتبار سے کن حالات سے دوچار ہوں گے؟ یہ محتاج بیان نہیں؛ لیکن ان کے اندر غیر معمولی جذبۂ قناعت محسوس ہوا، کھونے کے بعد بھی پانے کا احساس اور لُٹ جانے کے بعد بھی استغناء کی شان، ان کا عجیب وصف ہے، جو لوگ جس حال میں ہیں، وہ اس پر راضی ہیں، اہل مدارس سے لے کر عوام تک ہر جگہ یہ کیفیت محسوس ہوئی، سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بھی بہت کم ہیں؛ لیکن لوگ اپنے حالات پر مطمئن ہیں۔

تیسری چیز جس نے کم سے کم مجھے بہت متأثر کیا، وہ ہے علماء کے ساتھ عوام کا نیازمندانہ رویہ، اس کا تجربہ دہلی میں واقع افغانی سفارت خانہ سے لے کر افغانستان تک ہر جگہ ہوا؛ حالاں کہ موجودہ حکومت اور طالبان کے درمیان ٹکراؤ کی وجہ سے انھیں ہم جیسے حلیہ والے لوگوں سے بظاہر نفور ہونا چاہئے تھا؛ لیکن عوام تو عوام پولیس فورس اور سیکوریٹی گارڈ والے بھی ہم جیسے لوگوں کے ساتھ بڑی رعایت اور احترام کا معاملہ رکھتے ہیں، فجزاہم اللہ خیرالجزاء۔

بعض باتیں محل نظر بھی محسوس ہوئیں، ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس قدر دین داری اور مذہبیت کے باوجود نسلی اور لسانی تعصب کے اثرات اب بھی یہاں محسوس کئے جاتے ہیں، پشتو، تاجک، ازبک مختلف نسلوں کے مسلمان یہاں رہتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے درمیان پوری ہم آہنگی نہیں ہے، مثلاً روس سے جنگ کے دوران جو لوگ شہید ہوئے، جنھوں نے بڑے مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے، ان میں اوروں کی تو کہیں تصویر نظر نہیں آئی؛ لیکن احمد شاہ مسعود شہید کی تصویر ہر جگہ لگائی گئی ہے، نسلی تعصب بعض دفعہ لسانی تعصب میں بھی تبدیل ہو جاتا ہے؛ چنانچہ یہاں فارسی اور پشتو میں رقابت کا جذبہ نظر آتا ہے، علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تعصّبات کو ختم کرنے اور اسلامی اُخوت کے رشتہ کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کریں؛ ورنہ اہل مغرب اس اختلاف کو ایک بڑی نزاع میں تبدیل کر سکتے ہیں، جیسا کہ مختلف مسلم ملکوں میں کیا ہے۔

ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی بے ضرورت چھوٹے چھوٹے مدارس کا سیلاب آیا ہوا ہے، چند اداروں کو چھوڑ کر ان اداروں میں محض پچیس پچاس طلبہ ہوتے ہیں، بلاضرورت مدارس کی کثرت ملت کے کثیر سرمایہ کے ضیاع، عوام میں علماء کے تئیں بے اعتمادی اور خود علماء کے درمیان تنافس کا باعث بنتا ہے، بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ جنگِ روس کے درمیان افغانستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے پاکستان ہجرت کی، وہاں نوجوانوں نے دینی مدارس میں داخلہ لیا اور تعلیم حاصل کی، پھر جب وہ اپنے ملک واپس ہوئے تو انھیں مدارس کے قیام کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا؛ حالاں کہ اس وقت وہاں اسلامیات کے ساتھ عصری تعلیم کے اداروں، خدمتِ خلق کی تنظیموں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں افرادکار کی ضرورت ہے۔

اس بات کا پورا امکان ہے کہ آئندہ افغانستان میں ایسی حکومت قائم ہو، جس میں شریعت اسلامی کا نفاذ عمل میں آئے، ایسی صورت میں ایسے علماء کی ضرورت پڑے گی، جن کو مختلف شعبہائے زندگی سے متعلق مہارت حاصل ہو؛ اس لئے ضروری ہے کہ مدارس صرف درس نظامی کی کتابوں تک اپنی تعلیم محدود نہیں رکھیں؛ بلکہ ضروری حد تک عصری علوم کو بھی شامل کریں؛ ورنہ علماء کی جدوجہد مساجد و مدارس کی چہار دیواریوں تک محدود ہو کر رہ جائے گی اور مسلمانوں کا اسلام سے صرف عبادات کی حد تک رشتہ قائم رہے گا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فضلاء مدارس عصری تعلیم گاہوں کا بھی رُخ کریں اور اس میں اعلیٰ درجے کی صلاحیت حاصل کریں؛ تاکہ وہ زندگی کے تمام میدانوں میں ملک کی قیادت کر سکیں، وباللہ التوفیق۔

• • •